۴۸
۱۹۵۶
6

نگار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ للہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے ہر (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے ہر (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) قضا (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت ہر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائیہ لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے، قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں نماشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے کہ نماشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز و اتفاق نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادیین کا مذہب، نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

"نگار" کا آئندہ سالنامہ ۱۹۵۷ء

(اصنافِ سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کے لئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو اور جس کی ترتیب میں اُردو کے اہم لکھنے والے حصہ لے سکیں، چنانچہ موجودہ انتقادی دور کے پیشِ نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۷ء کا پہلا شمارہ اُردو شاعری کے تمام اہم اصنافِ سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کے لئے وقف ہو۔

یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شایقین ادب اُردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا، جس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے :-

صنف غزل :- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت ۔۔ (۲) اُردو غزل ولی سے غالب تک ۔ (۳) اُردو غزل غالب سے عہدِ حاضر تک ۔ (۴) دہلی اور لکھنؤ کا دبستانِ تغزل ۔ (۵) غزل کا مستقبل ۔

صنف قصیدہ :- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت ۔ (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور ۔ (ذوق، سودا، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری ۔

صنف مثنوی :- (۱) مثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات ۔ (۲) دکن کی مثنویاں ۔ (۳) مثنوی تاریخی نقطۂ نظر سے ۔ (۴) لکھنؤ، دہلی کی مشہور مثنویاں ۔

صنف مرثیہ :- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی ۔ (۲) دکن اور مرثیہ نگاری ۔ (۳) مرثیہ انیس تک ۔ (۴) مرثیہ انیس کے بعد ۔ (۵) انیس و دبیر ۔ (۶) واقعۂ کربلا کے علاوہ دوسرے مراثی ۔

صنف رُباعی و قطعات :- (۱) رُباعی پر تاریخی نظر ۔ (۲) اُردو کے مشہور رُباعی نگار ۔ (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جایزہ ۔

صنف ہجو و مزاح نگاری:- (۱) ہجو نگاری (تاریخی جایزہ) ۔ (۲) سودا بہ حیثیت ہجو نگار ۔ (۳) مزاحیہ و ظریفانہ شاعری ۔

صنف ریختی :- (۱) اُردو ریختی پر ایک نظر ۔

صنف نظم نگاری :- (۱) اُردو کی ابتدائی نظمیں ۔ (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر ۔ (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں ۔ (۴) رومانی نظمیں (۵) سیاسی و انقلابی نظمیں ۔ (۶) آزاد نظم ۔ (۷) فلمی نظمیں اور گیت ۔ (۸) واسوخت ۔

پروفیسر فراق ۔ پروفیسر مجنوں ۔ پروفیسر سرور ۔ پروفیسر احتشام حسین ۔ پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل پروفیسر ڈاکٹر ضیاء احمد بدایونی ۔ ڈاکٹر گیان چند ۔ مولانا اختر علی تلہری ۔ حضرت اثر لکھنوی ۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن ۔ پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین ۔ سید تمکین کاظمی اور دیگر حضرات کے خطوط مل گئے ہیں ۔

منیجر نگار

چند ضروری اعلانات

"نگار" کی اشاعت جولائی سے

"مشکلات غالب" کے زیرعنوان اڈیٹر نگار کے قلم سے ایک مستقل کتاب کا آغاز ہو رہا ہے، جس میں پہلے غالب کے اُردو کلام کی شرح و تفسیر پیش کی جائے گی اور اس کے بعد فارسی کلام کی۔ اس میں بتایا جائے گا کہ غالب کے سمجھنے میں اس وقت تک کس حد تک افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور دنیائے شاعری میں غالب کا صحیح موقف کیا ہے۔
امید ہے کہ دسمبر ۵۶ء تک یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد فارسی کلام کی شرح و تفسیر شروع کی جائے گی۔

پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیجدیں تاکہ پرچہ کی روانگی میں تاخیر نہ ہو۔ پاکستان کے بعض خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام جولائی کا پرچہ اسی وقت روانہ ہوگا جب اُن کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

"نگار" کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ وی۔پی مل سکتی ہیں

چندہ سالانہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۸ر کا فایدہ ہے کیونکہ رجسٹری کی فیس بڑھ جانے کی وجہ سے "نگار" کا سالانہ وی۔پی اب ۹ر۱۱ر میں روانہ ہوگا اور آپ کو ۱۱ر۸ر ادا کرنا پڑیں گے۔ جو حضرات سالنامہ ذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں وہ ۸ر زیادہ روانہ فرمائیں۔ **منیجر نگار**

فرحت میموریل مقابلہ مضمون نگاری

عنوانات :- (۱) اُردو کے جدید تنقیدی میلانات — (۲) اُردو ادب اور قومی رجحانات زندگی کی ترجمانی۔ (۳) اُردو زبان کا مستقبل

شرائط :- (۱) مضمون نگار کسی یونیورسٹی یا ڈگری کالج کا باقاعدہ طالب علم ہو۔ اپنے طالب علم ہونے کا سرٹیفکٹ اسے اپنی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا ڈگری کالج کے پرنسپل کے دستخط سے بھیجنا ہوگا۔ (۲) عنوانات بالا میں سے کسی ایک پر ۲۵ فل سکیپ صفحات پر لکھا جائے اور کم از کم چھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہو۔ مضمون غیر مطبوعہ ہو اور خاص طور پر اس انعامی مقابلہ کے لئے لکھا گیا ہو۔ (۳) مضمون کی تین نقلیں صدر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کے پاس زیادہ سے زیادہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۶ء تک بھیجدی جائیں — (۴) جج صاحبان کو اختیار ہوگا کہ مقالات کے معیاری نہ ہونے کی صورت میں بالکل انعام نہ دینے یا انعام میں تخفیف کر دینے کی سفارش کریں۔

نوٹ :- انعام ایک سو پچیس روپے ہے۔ نتائج دسمبر ۵۶ء تک شایع ہوں گے۔

عبدالعلیم رجسٹرار۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

کشاف اصطلاحات الفنون ... شیخ محمد علی عنہ۲۰ر
جہانگیر نامہ ..... خواجہ ابوالحسن ۴ر
آئین اکبری مصور سہ حصص - ابوالفضل فیضی معہ۸ر
سکندر نامہ مصور .... مولوی نظامی گنجوی ۴ر
دقایع نعمت خان عالی انشائے حسن وعشق ۴ر
درۂ نادرہ ..... مرزا محمد مہدی خاں عنہ۱۰
تاریخ گلستانِ ہند مصور .... درگا پرشاد عنہ۲۰ر
تاریخ جامع التواریخ ..... فقیر محمد صہ۱۵ر
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ .. محمد شریف معتمد خاں ... ۷۰ر
سیر المتاخرین سہ حصہ ... غلام حسین خاں لغہ۴۰ر
تذکرہ دولت شاہ .... دولت شاہ سمرقندی عنہ۱۰ر
دربار اکبری ..... آزاد عنہ۲۰ر
تذکرۂ گلِ رعنا ..... عبدالغنی صہ۱۵ر
کلیات ظہیر ..... حکیم ظہیر فاریابی ۴ر
قصاید عرفی مخشی ..... جمال الدین ۴ر
کلیات اسماعیل ... اسماعیل اصفہانی صہ۱۵ر
کلیات سعدی .... شیخ مصلح الدین سعدی ... صہ۱۵ر
دیوان عرفی ..... جمال الدین عرفی ۵ر
دیوان ہلالی مخشی ..... ہلالی ۵ر
دیوان قصاید عنصری ... حکیم ابوالقاسم ۴ر
تذکرہ کاملانِ رام پور ... احمد علی خاں عنہ۱۰ر
تذکرہ آبِ بقا .... عبدالرؤف عشرت ۵ر
ہندو شعراء ..... " للعہ۴ر
تذکرۃ النساء ... عبدالباری آسی ۷ر
تذکرۂ سخن شعراء نساخ عنہ۲۰ر
تذکرۂ گلشنِ ہند ... مرزا علی لطف عنہ۲۰ر

تذکرہ مخزن نکات ... قایم ۵ر
تذکرہ دستور الفصاحت ... یکتا ۷ر
تذکرہ چمنستان شعراء ..... شفیق صہ۱۵ر
تذکرہ ہندی ... مصحفی صہ۱۵ر
دیوان میر حسن ... میر حسن حسن ۴ر
دیوان شنگرف ... دیوان نسیم دہلوی ... محمد اصغر علی خاں .. عنہ۲۰ر
کلیات ناسخ ... امام بخش ناسخ عنہ۱۰ر
کلیات تسلیم ۴ر
کلیات سودا ... مرزا رفیع سودا عنہ۱۰ر
کلیات حسرت .... فضل الحسن موہانی ۴ر
کلیات مومن ... مومن خاں دہلوی عنہ۱۰ر
کلیات میر .... میر تقی میر عنہ۲۰ر
مکمل شرح کلام غالب ... مرتبہ عبدالباری آسی عنہ۱۰ر
مراۃ الغیب .... امیر احمد امیر ۴ر
مظہر معانی دیوان مجروح ... میر مہدی حسین ۴ر
دستور الشعراء (تذکیر و تانیث) ۷ر
کلیات جعفر زٹلی ... مرتبۂ محمد فرحت اللہ ۷ر
کلیات نظیر اکبر آبادی ... مرتبہ عبدالباری آسی عنہ۲۰ر
مراثی انیس .. جلد اول و دوم و سوم و چہارم .. میر انیس .. صہ۵۰ر
مراثی میر انیس ... جلد ششم - مرتبہ میر عبدالحسین عنہ۲۰ر
مراثی دبیر کامل صہ۳۵ر
مراثی مونس صہ۵ر
کریم اللغات صہ۵ر
تنقیح اللغات ... ضامن علی جلال لغت قلمی ... صہ۱۵ر
فردوسی پر چار مقالے ... محمود شیرانی عنہ۱۰ر
تاریخ حبیب السیر ... غیاث الدین بن ہمام الدین ۶۰ر

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت میں پہنچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بنک ڈرافٹ پہلے وصول ہو جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہو گیا اور اگست کا نگار آٹھ روپیہ نو آنے میں وی پی ہوگا۔ سالنامہ ۱۹۵۶ء کے مصارف رجسٹری کے لئے ۸ر اس کے علاوہ ہوں گے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۰	فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۵۶ء	شمار ۱

ملاحظات ۴
آتش لکھنوی (اپنے خطوط کے آئینے میں) ... نثار احمد فاروقی .. ۶
حالی اور شبلی ..... ڈاکٹر سید شاہ علی ۱۶
ایک عجیب و غریب تاریخی جرم ۳۲
تمدنِ جدید کی دردناک داستان ۳۷
مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے اور بعد .. مفتون احمد ۴۳
انتخاب کلام صادق ۴۷
منظومات:- فضا ابن فیضی، اختر بھوپالی، شفقت کاظمی، ندیم جعفری، بشر نواز، راز، شفا گوالیاری، قمر شاہجہانپوری ۵۰
مشکلات عالب ۵۳

ملاحظات

نئی سیاسی چالیں

اسٹالن کے زمانہ تک سرزمین روس ایک معمہ تھا جس کے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی تھی اتنا ہی زیادہ ناقابل فہم ہوتا جاتا تھا اور اس کے آہنی پردوں کے پیچھے دنیا کو خدا جانے کیا کیا نظر آتا تھا، لیکن اب کہ روس ارض ممنوع نہیں رہا اور نئی حکومت نے تمام پچھلے حجابات دور کر کے ساری دنیا کو حالات کے مطالعہ کا صلائے عام دیدیا ہے تو امریکہ جس کو کبھی روس کے اس قدر واشگاف ہو جانے کی توقع نہ تھی، اب اندیشہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ:-

"ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں" ——— اور اس کا اندیشہ غالباً غلط نہیں۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ روس اور امریکہ کا نظریاتی اختلاف کبھی دور نہیں ہو سکتا اور اعتقادی حیثیت سے دونوں میں ہمیشہ قطبین کا فرق قایم رہے گا، لیکن جنگ سے قطع نظر اب سوال یہ ہے کہ دنیا ان دونوں نظریوں میں سے کس طرف زیادہ مایل کی جا سکتی ہے اور عوام کی ذہنیت کس کے قبول کرنے میں زیادہ آمادہ ہے اور روس نے امریکہ کو کھلا ہوا چیلنج دیدیا ہے کہ اگر کامیابی کا انحصار اسی وسعت نظر پر ہے تو وہ اس باب میں بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہے اور امریکہ کے اس کمر دوستی کو جس سے وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کام لیتا چلا آرہا ہے، شاید اس سے بہتر طریقہ پر اختیار کر سکتا ہے۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد امریکہ نے اپنی دولت کی قوت سے جن جن ملکوں کو خریدنا چاہا ان کی تعداد اس میں شک نہیں اس کی مادی قربانیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اٹلانٹک کو چھوڑ کر بحر روم اور بحر الکاہل میں بھی اس کا اقتدار قایم نہ ہوا اور مشرق وسطیٰ کے مسایل کو بھی وہ خاطر خواہ طے نہ کر سکا۔ اس میں شک نہیں کہ بغداد پیکٹ امریکن بلاک کی سب سے بڑی ڈھال تھی، لیکن مصر اور سعودی عرب کے اس پیکٹ میں شریک نہ ہونے سے اس میں اتنا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اسے

محض دولت سے پُر نہیں کیا جا سکتا کہ دیانت اخلاق سے اور اس کا فقدان اسرائیلی حکومت کے مسئلہ میں امریکن بلاک کی طرف سے پہلے ہی ظاہر ہو چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ روس اس فرصت کو ہاتھ سے نہ دے سکتا تھا، چنانچہ اس نے فوراً مصر اور سعودی عرب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، یہاں تک کہ آخر کار مصر نے اس کی اسلحہ فراہم کرنے کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ بغداد پیکٹ میں علاوہ عرب کی بعض ریاستوں کے، ہندوستان و ایران بھی شریک ہیں، لیکن ان کی شرکت کا اثر مشرق وسطیٰ کے مسایل پر اتنا نہیں پڑتا جتنا روس کی ایشیائی سرحد پر اور اس حقیقت کے پیشِ نظر پاکستان و ایران کو بھی بغداد پیکٹ میں شریک کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کی تکمیل بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان اس پالیسی کا ہمنوا نہ ہو اور اس کا قطعی کوئی امکان نہیں۔

روس کی جدید پالیسی نے جو تمام ضرورتمند ممالک کی غیر مشروط اقتصادی و صنعتی امداد سے تعلق رکھتی ہے، امریکن بلاک کی بہت سی امیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے، یہاں تک کہ وہ قومیں بھی جو اپنی نجات اسی میں سمجھتی تھیں کہ امریکہ یا برطانیہ کا دامن پکڑے رہیں، اب سوچ رہی ہیں کہ وہ کب تک غیروں کی دست نگر رہیں گی اور ان میں بھی ایک مستقل بقاء ذاتی کا احساس ہو چلا ہے۔

چند دن کی بات ہے کہ پاکستان میں روس اور چین کا نام لیا جانا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ ہم سُن رہے ہیں کہ پاکستان کے وزیر اعظم چین جانے والے ہیں اور روس سے بھی اقتصادی و صنعتی معاہدے کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بالکل یہی صورت ایران کی ہے کہ اب سے قبل اسکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہاں کا فرمانروا روس کی سرزمین میں قدم رکھنا کبھی گوارا کرے گا، لیکن یہ ظلم بھی ہو کر رہا اور امریکن بلاک اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں روس نے ایشیا و یورپ کے مختلف ممالک کے ساتھ اپنی دوستی کا جال جس تیزی سے پھیلایا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں اور اسی لئے ڈلیز بے اختیار کہہ اُٹھا کہ روس کی موجودہ پالیسی، اسٹالن کی پالیسی سے زیادہ خطرناک ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ روس کی موجودہ پالیسی کوئی جمہوری پالیسی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ بلگانن اور خروشچیوف کے بعد کوئی دوسرا اسٹالن پیدا ہو کر موجودہ نقشہ بگاڑ کر رکھ دے، لیکن دُنیا کی عام موجودہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ بہت کم ہے کہ روس کھرا اُلٹے پاؤں واپس جائے گا، اور اگر کسی وقت یہ غلطی اس نے کی تو پھر اس کا زندہ رہنا مشکل ہے کیونکہ دشمن کو دشمن رکھ کر تو زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن دوستوں کو دشمن بنا کر جینا بہت مشکل ہے۔

کرنل ناصر اور مصر

کرنل ناصر کا مملکت مصر کا صدر منتخب ہو جانا خوشی کی بات ہے، لیکن تعجب کی نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ وہاں کی عسکری حکومت کی مدت چار سال مقرر کی گئی تھی اور وہ اسی میعاد کے اندر ختم ہو گئی اور تعجب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کرنل ناصر کے مقابلہ میں کسی اور جماعت کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہ تھی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں کرنل ناصر کے سوا کسی دوسرے کا انتخاب ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ انفرادی حیثیت سے لوگوں کو مقابلہ کی اجازت ضرور تھی، لیکن جب تک کوئی جماعت کسی فرد کی پشت پر نہ ہو کامیابی محال ہے۔ اس لئے مصر میں جو کچھ ہوا وہ کوئی جمہوری رائے شماری نہ تھی بلکہ صرف اعتماد کا ووٹ تھا جو کرنل ناصر نے حاصل کیا۔ فرق اگر ہوا تو صرف اس قدر کہ حکومت پہلے کرنل ناصر کے ہاتھ میں تھی اور اب پریسیڈنٹ ناصر کے ہاتھ میں ہے۔

شخصی حکومت کی لعنت سے آزاد ہونے کے بعد بھی نہر سویز پر برطانوی قبضہ کا پھندا جو مصر کے گلے میں پڑا ہوا تھا اس سے ہر چند مصر کو رہائی مل گئی ہے، لیکن وہاں کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہے کہ جب تک اس کو درست نہ کر لیا جائے، مصر اپنی بیرونی پالیسی کو استوار کر ہی نہیں سکتا اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار ہے۔ تاہم یہ امر قابل اطمینان ہے کہ اقتصادی طوفان میں گھرنے کے بعد بھی وہ ہر تنکے کا سہارا لینے اور اپنی قومی خودداری کو ہاتھ سے دینے کے لئے آمادہ نہیں۔

اثرؔ لکھنوی

اپنے خطوط کے آئینے میں

(بہ سلسلۂ ماہ جون ۵۶ء)

(نثار احمد فاروقی)

۲۲ر جنوری

پیارے بھائی فاروقی — ۲۲ر جنوری کا خط ملا - میں بھی غالبؔ کا مداح ہوں اور اُسی کی طرح معتقدِ تیر- بہاراں میں آپ نے یہ اشعار پڑھے ہوں گے:

میر و غالبؔ سے اثرؔ ہے گرمیِ بزمِ سخن — وہ خدائی کر گیا اور یہ پیمبر ہو گیا

طرحِ غالبؔ میں غزل کہنا نہیں آساں اثرؔ — "رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے"

دوسرے مقطع سے یاد آگیا کہ اسی طرح میں ایک شعر بعد کو نظم ہو گیا جو بہاراں میں درج نہیں ہے۔ آپ کو سُنانے کے قابل ہے۔

ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا بزمِ جہاں میں بے خبر — حُسن کہتے ہیں جسے اک نقشِ رنگیں دل میں ہے

مجھ میں یہ بُری بُری عادت ہے کہ کسی مضمون کا مسودہ اپنے پاس محفوظ نہیں رکھتا۔ "تحریک" کے دفتر سے حاصل کیجئے۔ ورنہ جب "تحریک" کا وہ نمبر جس میں مصحفی پر مضمون ہے آئے گا تو میں حاضر کر دوں گا۔ مصحفی کا جو قلمی دیوان میرے پاس ہے، اُس کا ایک دوسرا دیوان حال ہی میں لکھنؤ سے شایع ہوا ہے وہ بھی لیتا آؤں گا۔ ایک انتخاب حسرت موہانی نے چھاپا تھا۔ خیال پڑتا ہے کہ وہ بھی میرے پاس ہے۔ ڈھونڈھوں گا اگر مل گیا تو وہ بھی لیتا آؤں گا۔ اس کے علاوہ مختلف تذکروں سے اس کے اشعار لے کر جمع کر لئے ہیں۔ کوئی صاحب کہتے تھے کہ خدا بخش لائبریری بانکی پور (پٹنہ) میں مصحفی کا پورا کلام موجود ہے۔

کلام انشاؔ کا کوئی قلمی نسخہ میرے پاس نہیں ——— مگر ایک قدیم مطبوعہ نسخہ ہے جو صاف اور عام طور پر کتابت کے اغلاط سے پاک ہے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک مضمون انگریزی میں Aryan Path بمبئی میں شایع کیا تھا۔ اُس میں میں نے بتایا تھا کہ انشاؔ سے پیشتر اُردو شاعری میں Fancy یعنی Highest Play of Imagination کا وجود نہیں تھا۔ انشاؔ نے یہ کمی پوری کی:-

مثلاً:- تجھ سی نازک پری کو چاہئے ہے — صرف پھولوں کے ہار کا جھولا

غنچۂ گل کی صبا گود بھری جاتی ہے — اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

انکھڑیاں سرخ ہو گئیں چٹ سے — دیکھ لیجئے کمال بوسے کا (وغیرہ وغیرہ)

میں اُس زمانہ میں الہ آباد ڈویژن کا اڈیشنل کمشنر تھا اور — صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی تھی یہ مضمون بھی اُن کو سنایا تھا۔ بلا تامل

ری دریافت کو اپنا کہکر رسالۂ نگار میں چھاپ دیا مگر اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ محض "نقاد" لکھا! خدا حافظ - اثر

اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر میں انشا کے بارے میں کچھ کہنا مناسب سمجھوں گا۔ شیخ مصحفی اور انشا دونوں ہمعصر تھے اور اُن کے معرکوں سے اُردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ تاریخ میں آج تک مصحفی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ شیخ مصحفی کو اگر اُردو شاعری کا مسیحا کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔

انشاء، رنگین اور اُن کے ساتھیوں کی بدولت اُردو شاعری کی مٹی پلید ہوئی، خارجیت اور ریختی کا زور بڑھا کنگھی، سرمہ، انگیا، چولی اور جوبن کا نام اُردو شاعری رہ گیا، اگر وہ سیلاب بڑھتا رہتا تو آج اُردو شاعری دو کوڑی کے مول بھی مہنگی ہوتی شیخ مصحفی نے اُس دور میں شاعری کی روایات اور آداب والقاب کی نگہداشت کی، اور اُن کی ذات نے ایک پورے ادارے کا کام کیا۔ اگر مصحفی نہ ہوتے تو مومن، داغ، غالب، انیس، حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی تک جتنے نام بھی اُردو کے زندۂ جاوید شاعروں کی فہرس میں آتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتا۔ رنگین و انشاء کی ریختی ہوتی، جعفر زٹلی کی زٹلیات ہوتیں، جان صاحب کا کلیات ہوتا اور چرکین کا دیوان!"

میں نے اثر لکھنوی کا مذکورہ مضمون نہیں پڑھا ہے لیکن صرف اتنی بات کی روشنی میں جو اُنھوں نے اس مکتوب میں ارشاد فرمائی ہے یہ عرض کروں گا کہ Xightan play & imagination مجھے قلی قطب شاہ کی شاعری میں بھی ملی ہے اور میر کے یہاں بھی ڈھونڈے سے دس بارہ اشعار تو مل ہی جائیں گے جو اس خصوصیت کے حامل ہوں اتنے ہی اشعار انشاء کے یہاں ہوں گے اور اُن کی روشنی میں انشاء کو Fancy کا اولین موجد نہیں کہا جا سکتا۔

زمانہ ہوا انشاء پر ایک مضمون غالباً مولوی محمد یحییٰ تنہا کا شایع ہوا تھا اُس کے اوراق ہمیں اب دستیاب ہوئے ہیں اُنھوں نے جتنی ایمانداری، بے خوفی اور اعتدال کے ساتھ انشا کے کلام کا جایزہ لیا ہے وہ اُردو کی تاریخ میں پہلی ایماندارانہ کوشش ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک وقت وہ آئے گا جب اُردو کا تاریخ نگار انشا کو 'فن شاعری' کا بدترین دشمن اور مصحفی کو اُس کا بہترین دوست قرار دے گا، جس نے "تیغ اور بھالے کی شاعری" کا سیلاب اپنے بوڑھے اور ناتواں دل و دماغ سے روکا اور سیکڑوں شاگردوں کے ذریعہ اس پودے کو "انشائیت" و "رنگینیت" کی آگ میں جھلسنے سے بچا دیا۔ محمد یحییٰ تنہا کے مذکورہ مضمون کے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:-

"... آپ کا (انشاء) کلام تمام کا تمام جو غزلیات کے نام سے درج ہے رکاکت اور سخافت کے آخری درجے پر ہے۔ اگر ہم اس کو دیوان ہزلیات کہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کاش سر لوح پر دیوان ہزلیات لکھا ہوتا..... افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے آپ کے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اس سے دریغ کیا، اور آپ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر صاف صاف جو کہنا تھا نہ کہا..... آپ کے خیالات عشق مجازی کے کیا معنی بلکہ بوالہوسی کے لئے بھی باعث شرم ہیں..... آپ کے دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور ہم کو بمشکل تمام بہتّر اشعار ایسے دستیاب ہوئے ہیں جو سخیف و رکیک نہیں ہیں اگرچہ وہ بھی اعلیٰ اشعار میں شمار نہیں کئے جا سکتے..... مختصر یہ کہ کوئی شاعر آج تک ایسا نہیں گزرا جس کا سنجیدہ کلام اس قدر سبک، اس قدر رکیک اور اس قدر لغو ہو جیسا کہ سید انشا کا ہے۔ شاعری ایسے شاعر سے پناہ مانگتی ہے اور اُردو شاعری تو سید انشا کے نام سے کانپتی ہے..... جناب مصحفی نے اگرچہ سید انشا کی ہجو میں کہا ہے لیکن ہرگز اس میں مبالغہ نہیں اور بالکل سچ کہا ہے: ع "واللہ کہ شاعر نہیں تو، بھانڈ ہے بھڑوے"..... "اس پُر آشوب زمانہ میں اگر کسی شاعر نے قدیم روایات کو قایم رکھا اور مسلک شاعری پر استقلال اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ گام زن رہا تو وہ صرف مصحفی ہے۔ ورنہ یہ اُردو شاعری جو کچھ ہمیں نظر آتی ہے وہ بھی لکد کوب حوادث کی متحمل نہ ہو سکتی..."

اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے کلیات کا جایزہ لے کر بتایا ہے کہ انشاء کے ہاں متروکات بدستور ملتے ہیں، زبان کی اکثر فاحش غلطیاں

الفاظ بے حد ثقیل، غریب اور نامانوس استعمال کرتے ہیں - ردیف قافئے بے حد ثقیل، اور ٹیڑھے استعمال کئے ہیں اور کسی قافئے میں بھی مضمون آفرینی نہیں ملتی - اور آخر میں وہ ۷، اشعار درج ہیں جو بمشکل تمام پورے دیوان غزلیات سے نکالے جاسکے اور جن میں رکاکت ابتذال، سخافت اور سوقیت نہیں ہے -

یہاں انشاؔ و مصحفی کا موازنہ و مقابلہ یا بحث و تمحیص کا موقع نہیں تھا - لیکن یہ صرف اس واسطے عرض کیا گیا کہ میں ابتدائے مطالعہ سے لوگوں کی خوش فہمیاں حضرت انشاؔ کے بارے میں دیکھ آیا ہوں - حالانکہ وہ اُردو شاعری میں موجد کہلانا تو بڑی دور از کار بات ہے ہماری شاعری کی صالح روایات کا مخرب ہے ! پتہ نہیں یہ بادل کب چھٹیں گے کہ لوگ مصحفی نام کے ایک شاعر کو بھی پہچانیں - جو دہلی اور لکھنؤ اسکول کا مورثِ اعلیٰ ہے اور جسے 'موجد' ہی نہیں بلکہ 'محی' کہنا چاہئے !

کشمیری محلہ - لکھنو - ۲ر فروری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - ۳۰ر جنوری کا محبت نامہ کل شام کو ہردوئی سے واپسی پر وصول ہوا - کل الہ آباد جا رہا ہوں - غالباً دو تین دن بعد پلٹنا ہو - ہندوستانی اکیڈیمی کی سلور جوبلی کے موقع پر میری صدارت میں مشاعرہ ہونے والا ہے -

"نالۂ بلبلِ شیدا ہے پریشاں مجھ سے" مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ مطلع سست ہے - قلمزد کر دیا - گل کے دامن میں صد پارہ گریباں ہونا گل کی شکستگی سے مراد ہے - بہاراں میں صفحہ ۶۰ پر یہ مطلع ہے اُس میں یہ خیال واضح ہے ؎

اے جنوں اب وہ ہوائیں ترے گلشن میں نہیں
گل کے مانند گریباں مرے دامن میں نہیں

اس غزل کے چار شعر اور ہیں جو بہاراں میں درج ہونے سے رہ گئے :

دل کے چھالوں کو تپکتے نہیں دیکھا ہے ابھی
برق آوارہ ہے جب تک مرے خرمن میں نہیں

تن بدن پھونک دیا اور دھواں تک نہ اُٹھا
جو تپش داغِ جگر میں ہے وہ گلخن میں نہیں

للہ الحمد کہ تلبیس سے ہے پاک ضمیر
نفس کی باد فروشی مرے گلشن میں نہیں

شعر کیا ؟ موقلمِ عشق سے تصویرِ جمال
کوئی استاد کسی کا اثر اس فن میں نہیں

اب پھر زیرِ نظر غزل لیجئے :- "جلوہ گر تو جو ہوا خلوتِ اندیشہ میں" الخ - اندیشہ خطرے کے علاوہ سوچ بچار، فکر، تصور بھی ہے - غالب نے اندیشہ اس معنی میں متواتر استعمال کیا ہے مثلاً ؎

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

"جلوہ گر تو جو ہوا خلوتِ اندیشہ میں" ایسی خلوت جس میں محبوب کے تصور کے سوا کسی کا دخل نہیں اور یہ تصور جلوے کا بصورت گری کرتا ہے -

"موج سے سوج کے ٹکرانے کے عالم کے سوا" - میں تسلیم کرتا ہوں کہ شعر کی بندش چست نہیں - ہیاض سے خارج کر دیا ہوتا "سوج" محاورہ ہے، اترانا، غرور کرنا -

میں بقسم کہتا ہوں کہ میری نظر میں آپ کی رائے کی بڑی وقعت ہے - اسی طرح میرے اشعار کو پرکھتے اور مجھے مطلع کرتے رہئے - ناخوش ہونا کیسا، میں آپ کا احسان مند ہوں[1] -----

آپ کا اثرؔ

---

[1] نثارِ بے نوا، نواب جعفر علی خاں اثرؔ کا مرہونِ منت ہوں کہ انھوں نے میرے بعض شبہات کے اظہار کو بسبیبِ خاطر گوارا فرمایا اور یہ محض اُن کی قدر افزائی ہے کہ ایسے اشعار کا "پرکھنا" سمجھا - کوئی صاحب یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ میں اپنی علمیت یا قابلیت کا سکہ بٹھانے کو حضرت اثرؔ مدظلہ کے یہ مکتوب نقل کر رہا ہوں - واللہ کہ اُن کے مقابلہ میں میری حیثیت پرِ کاہ کی بھی نہیں - جہاں تک "قابلیت" کا تعلق ہے اُس کا بھانڈا بھی جلد ہی پھوٹ جائے گا - جب میری جہالت "تپکنے" کے غیر فصیح ہونے کا شبہ کرے گی ! دیکھتے جائیے - ۱۲

کشمیری محلہ - لکھنؤ - ۶ر فروری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - آپ کی غزل بڑے شوق سے پڑھی، ماشاءاللہ خوب ہے۔ "شامیں" قافیہ معمولہ بڑے حسن سے نظم ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اشعار خاص طور پر پسند آئے ؎

کیا جانئے ہوا کیا جو ربط باہمی تھا — نکہت میں اور گلوں میں غنچوں میں اور صبا میں
خوں گشتہ آرزوئیں لائی ہیں رنگ کیا کیا — کچھ تابشِ شفق میں کچھ سرخیِ حنا میں

مطلع میں لفظ "قیمت[1]" کچھ جچتا نہیں اس کی جگہ "تلخی" کیسا ہو؟ کتنی لگاوٹیں ہیں..... اس شعر میں ردیف کی تکرار[2] ہے جو معیوب ہے۔ اگر مصرع کے دونوں ٹکڑے مقدم موخر کر دیجئے تو یہ عیب نکل جائے۔ "ان کم نگاہیوں میں کتنی لگاوٹیں ہیں"۔ "کچھ آرہی ہے منزل کچھ بڑھ رہے ہیں رہ رو"[3]۔ آرہی ہے کی جگہ "گھٹ رہی ہے" کیسا ہو؟

میر دہلوی کا مقطع ہے ؎

لوہو میں شور بور ہے دامان وجیبِ میر — پھرا ہوا ہے دیدۂ خونبار بے طرح

ناسخ لکھنوی کہتا ہے ؎

خم سے برسات میں اس درجہ ہوا جوشِ شراب — ہوگئی بادۂ گلگوں سے شرابور گھٹا

..... خدا حافظ آپ کا اثر

۷ر فروری

پیارے بھائی فاروقی - کل صبح کو ایک خط روانہ کر چکا تھا۔ شام کو آپ کا ۵ر فروری کا تحریر کردہ خط ملا۔ پچھلے خط میں الہ آباد نہ جانے کی وجہ لکھ دی تھی۔ ہر دوئی کے مشاعرے میں قابل ذکر موجودگی حضرت جگر مراد آبادی کی تھی۔ وہی بار بار کی سنی ہوئی غزل "پھول کھلے ہیں گلشن گلشن" پڑھے تھے۔ خدا کرے کہ آپ مجھ سے گستاخ اور بے حد گستاخ ہو جائیں تاکہ میرے اشعار کو بے کہتے اور انکے معائب سے مجھے آگاہ کرتے رہیں۔ ایسے دوست قسمت ہی سے ملتے ہیں۔ آپ تپکنے کو مصدر کیوں کہتے ہیں؟ اس میں علامت مصدری "نا" کہاں ہے؟ یہ تو تپکنا سے فعل حالیہ ہے۔ "تپکتے نہیں دیکھا ہے ابھی" یعنی تپکتے وقت یا تپکنے کی حالت میں نہیں دیکھا ہے۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے:- "دل کے چھالوں کا تپکنا نہیں دیکھا ہے ابھی"۔ یہ ایک عام بات ہوتی، وہ تخصیص پیدا نہ ہوتی جو "تپکتے نہیں دیکھا" میں ہے۔ اگر کچھ اور شبہ ہے تو اس کی وضاحت کیجئے۔ ؎

دل کے چھالوں کو تپکتے نہیں دیکھا ہے ابھی — برق آوارہ ہے جب تک مرے خرمن میں نہیں

اس سے بہتر پہلا مصرع میرے ذہن میں نہیں آتا۔ دل کے آبلے خرمن ہیں۔ اُدھر برق میں تڑپ ہے اِدھر آبلوں میں تپک ہے۔ اس میں چمک ہے ان میں "آب" ہے۔ برق، خرمن پر گرتی ہے۔ اس "خرمن پر گرتی ہے۔ اس "خرمنِ آبلہ" پر گرے تو اس کو تاراج کرنے کے بجائے خود اس "آبلہ زار تپش" میں اسیر ہو کر رہ جائے۔ ان آبلوں کی تپک میں اس کی تپیدگی جذب یا سلب ہو جائے یہیں کی ہو رہے۔ اِدھر اُدھر ماری ماری (آوارہ) نہ پھرے۔ اس سے زیادہ جاندار کوئی مصرع سوچئے اور مجھے مطلع کیجئے۔ اگر اس سے زیادہ معنی خیز ہوا تو اظہار تشکر کے ساتھ قبول کروں گا۔ آپ کو جو اشعار پسند آئے مجھے عزیز ہو گئے۔ آپ کو وہ غزل پسند آئی جس کی ردیف "اب تک" ہے۔

---

[1] شعر یہ تھا ؎ — اتنا اثر تو دے دے یارب مری دعا میں، — کچھ اور وہ بڑھا دیں قیمت مری، جفا میں

[2] شعر تھا ؎ — کتنی لگاوٹیں ہیں ان کم نگاہیوں میں، — کیا بے حجابیاں ہیں اس پردۂ حیا میں!

[3] شعر یہ تھا ؎ — کچھ آرہی ہے منزل کچھ بڑھ رہے ہیں رہ رو — ہر سانس اک قدم ہے اس جادۂ فنا میں

بہاراں کے صفحہ ۲۶۹ پر ایک غزل ہے جس کی ردیف "کب تک" ہے۔ اُس کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے ؎

بھلا کس سے ہو ضبطِ شوق ان رنگیں اشاروں پر — نہ ملتا شمع سے پروانۂ آتش بجاں کب تک

اس غزل میں ایک شعر بعد کو اضافہ ہوا ہے ؎

بدل جائیں گی شعلوں میں یہی تپتی ہوئی روحیں — اُٹھے گا آتش خاموش سے خالی دھواں کب تک

شاید حالاتِ حاضرہ پر منطبق ہوتا ہے پسند آئے تو حاشیے پر لکھ لیجئے۔

اب میں انشاء اللہ ۲۵ کے بجائے ۲۴ ہی کو دہلی پہونچ جاؤں گا۔ اُسی شب کو ریڈیو کا مشاعرہ ہے اور مجھے بھی مدعو کیا ہے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے کوئی غزل انتخاب کر رکھئے۔ کل یہاں بھی بارش ہوئی اور سردی پھر چمک گئی۔ نہ معلوم کیوں آنکھوں کے مضمون کا ایک شعر یاد آگیا خالص ہندی یا ہندوستانی زبان میں ہے ؎

امرت بھری آنکھوں میں مدھر آنکھ کی پُتلی — راد ھا ہے کہ گا گر لئے پنگھٹ پہ کھڑی ہے

مطلع بھی یاد آگیا ؎

ہنسنے پہ ملامت ہے تو رونے پہ ہنسی ہے — کس شوخ ستمگار سے آنکھ اپنی لڑی ہے

ساقی میں جو مضمون شائع ہوا ہے اُس میں فراق کے بعض اشعار کی اصلاحیں ملاحظہ فرمائیے :-

شعر فراق ؎	جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے سحر ہوتے	افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
اصلاح اثر ؎	سحر ہوتے جو ہونٹوں پر ترے رہ رہ کے آتی ہے	افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
شعر فراق ؎	یہ نغمے اپنے آپ اُٹھتے ہیں سازِ قلب سے جس دم	رگِ غم کو شعاعِ غیب کوئی چھیڑ دیتی ہے
اصلاح ؎	اُبل پڑتے ہیں نغمے فاتحانہ ساز سے دل کے	رگِ غم کو شعاعِ غیب جس دم گدگداتی ہے
شعر فراق ؎	ہزاروں رنگ پیدا کے ہزاروں راز پنہاں کے	چمن کھل جاتے ہیں وہ آنکھ جب مسکراتی ہے
اصلاح ؎	ہزار اندر ہزار اسرارِ پنہاں وہویدا کے	چمن کھل جاتے ہیں جب آنکھ تیری مسکراتی ہے
شعر فراق ؎	تو یاد آئے ترا جور و ستم بالکل نہ یاد آئے	تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے
اصلاح ؎	" " " "	محبت میں " " "
شعر فراق ؎	دلوں میں آرزو کی کائناتیں جاگ اُٹھتی ہیں	نگاہِ ناز کی پہلی کرن جب کسمساتی ہے
اصلاح ؎	تمنا کرتی ہیں کیا کیا پیار سے ترسی تمنائیں	نگاہِ ناز کی پہلی کرن جب رسمساتی ہے
شعر فراق ؎	ازل کی صبح سے ہم کو ہم آہنگی ہے فطرت سے	دلِ شاعر جو بیٹھے نبضِ فطرت ڈوب جاتی ہے
اصلاح ؎	ازل سے ہم میں اور فطرت میں باہم ہے ہم آہنگی	دلِ شاعر جو ڈوبے نبضِ فطرت چھوٹ جاتی ہے
شعر فراق ؎	محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں	بہت جاگا ہوں اے شامِ فراق اب نیند آتی ہے
اصلاح ؎	محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں	بہت جاگا ہوں اے صبحِ فراق اب نیند آتی ہے

ابھی نہ معلوم اور کتنی اصلاحیں ہیں۔ صرف وہ اشعار لئے ہیں جو فراق صاحب کے مایۂ ناز سمجھ کر پیش کئے گئے تھے اور اس دعوے کے ساتھ کہ ان کی نظیر کسی شاعر ماضی کے کلام میں نہیں ملتی۔

اثر

۱۲ فروری ۵۲ء

پیارے بھائی فاروقی ۔ شدید انتظار کے بعد آپ کا خط ملا ۔ سلسلہ وار جواب عرض کرتا ہوں۔ "اتنا اثر تو دے یارب مری دعا میں"

اس کا مصرع ثانی یوں کیسا ہو؟ "تو تو ادائیں نکلیں بیداد آشنا میں"۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔ میرا مطلع

سنا کرو کہ وہ شرما کے منہ چھپاتا ہے دلِ خراب کی بیتابیاں بڑھاتا ہے

سنا کرو یقیناً بے جان ٹکڑا ہے۔ اس کی جگہ "میں جانتا تھا کہ شرما کے منہ چھپاتا ہے"۔ ہوسکتا ہے مگر شعر بجھا بجھا سا ہی رہتا ہے

بیاض میں قلمزد کردیا یہی حشر تیسرے مطلع[1] کا بھی ہوا ؎

آلِ زلیست کبھی اُس پہ آئینہ نہ ہوا خیالِ عیش دو روزہ جسے لبھاتا ہے

میں آپ کا ہم نوا نہیں ہوسکتا۔ آئینہ نہ ہوا کی جگہ آئینہ ہوجائے کہنے سے شعر کی آفاقیت فنا ہوجاتی ہے۔ علاوہ بریں ایسے شخص سے ہمدردی اور اس کی اصلاح کا خیال بے سود ہے، شعر سن کر خود ہی چونکے تو دوسری بات ہے۔ دوبارہ غور فرمائیے۔

تپکنے کو آپ نے مصدر لکھا تھا۔ اس سے میں نے عرض کیا کہ مصدر نہیں فعل ہے۔ تعجب ہے کہ دہلی میں یہ لفظ رائج نہیں۔ فیلن کی ڈکشنری میں درج ہے اور اس ڈکشنری کی بنیاد دہلی کی زبان ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ اس کی ترتیب میں شریک کار تھے۔ فیلن کی عبارت یہ ہے:-

تپک = palpitation. Throb ; تپنا کا مفہوم دھوپ آنچ یا گرمی تک محدود ہے یا پھر مجازاً بے عرقہ آنا، پیچ و تاب کھانا ہے۔ فیلن میں اس کے یہ معنی دئے ہیں:- To be heated, To glow.

تمتمانا = رنگ سے مخصوص ہے، فیلن:- To glow, to be flushed in the face.

کھولنا = پانی یا مزاج سے مخصوص ہے، بقول فیلن:- To boil, to over-boil to burn mentally.

چلچلانا = صرف دھوپ کی تیزی کے لئے آتا ہے۔ فیلن میں یہ لفظ درج نہیں۔ نور اللغات میں ہے۔

چلچلاتی دھوپ = جلتی ہوئی دھوپ، بہت تیز دھوپ۔

چلچلاتا = چیل کا بولنا، بے فایدہ شور و غوغا کرنا۔

ظاہر ہے کہ چھالوں یا آبلوں کے ساتھ تپکنا کے سوا یہ کوئی لفظ موضوع نہیں۔ میں آپ سے متفق نہیں کہ تپکنا ٹھٹھرا ہوا لفظ ہے۔ اضطراب و التہاب کے اظہار کو اس سے بہتر آپ کے نقل کردہ الفاظ میں کوئی لفظ نہیں۔ جلال لکھنوی کا شعر ہے ؎

چھیڑ کر خود ہی رُلاتا ہے لہو آخرکار نیشتر آبلۂ دل کی تپک ہوتی ہے

عزیز لکھنوی ؎

رہ رہ کے میرے دل کا چھالا تپک رہا ہے بجلی چمک رہی ہے کوندا لپک رہا ہے

ہاں ایک اور لفظ لپک ہے۔ یہ پھوڑے کی ٹیس اور کھولن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ۲۴ کو دہلی میں غالب ڈے منایا جا رہا ہے حمیدہ سلطان صاحبہ نے مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ عجب نہیں کہ ۲۴ کے بجائے ۲۳ ہی کی صبح کو دہلی پہونچ جاؤں۔

نریش کمار شاد صاحب کا شعر خوب ہے ؎

زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جب سے ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہے

بہاراں کے بعد کی ایک غزل میں میرا شعر ہے ؎

ذرا تو بھی تو سن، سچ ہے کہ میرے کان بجتے ہیں قدم کی اُن کے آہٹ ہم نشیں معلوم ہوتی ہے

مگر یہ حقیقت ہے کہ شاد صاحب کا شعر بہت بلند ہے۔ مفہوم کچھ ملتا جلتا تھا اس سے اپنا شعر درج کر دیا۔ بہاراں کے صفحہ ۱۸۱ والی غزل کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ ارے بھائی اس میں چند شعر بعد کو موزوں ہوگئے تھے سنئے اور اگر کوئی پسند آئے تو بہاراں میں اضافہ کر لیجئے

ایسی بھی کرنیں پھوٹیں عرفاں کی سرزمیں سے خود میں نے اپنے سجدے پھر چن لئے جبیں سے

---

[1] سرشک یاس جو مژگاں پہ تھرتھراتا ہے فسانۂ ستم آشنا سناتا ہے

اے کاش ایک سجدہ یوں ہو ادا جبیں سے — جیسے شراب چھلکے لبریز ساغریں سے
اس آستاں کا سجدہ اور بعد اذن سجدہ — شرمائے کیوں نہ رنگ روئے سحر جبیں سے
اسرار ماسوا کے آئینہ ہوں تو کیوں کر — سمجھے گئے ابھی تک خود ہی نہ جب ہمیں سے
آنکھیں لڑا لڑا کے یہ کون مسکرایا — کلیوں نے منہ چھپایا شبنم کی آستیں سے

آپ کو یہ شعر پسند آیا ہے

تھا سرنشینِ بزم مے کچھ دن اُدھر کی بات ہے — آج ایک جام کے لئے ترسا کیا، نہیں ملا

یہ بحر میری ایجاد ہے۔ اُردو یا فارسی میں کوئی غزل اس بحر میں موجود نہیں۔

ے نہ سنانا تھا جس کو آج اُس کو — ماجرائے الم سُنا بیٹھے

آج اُسے کہنے سے تقابل کی اہمیت اور سنانے کے دل شکن و یاس انگیز نتائج کی طرف جو اشارہ ہے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ جس کو اور دوسری جگہ اُسے کہنے سے تو یہ صورت بہتر ہے :۔ "نہ سنانا جسے تھا آج اُسے"۔ یوں بھی مصرع پھُسپھُسا ہو جاتا، میں مجبور ہوں۔ اختلاف ناگزیر ہے۔ اسی طرح یہ ترمیم طبیعت قبول نہیں کرتی کہ ؎

جنھیں شرم عصیاں نے جائز نہ رکھا — وہ سجدے عرق بن کے ٹپکے جبیں سے

میں جایز نہ رکھا کی جگہ ادا نہ کر پائی ہو۔ جواز سجدہ میں تامل ہونا ادائے سجدہ میں تامل ہونا، ادائے سجدہ میں تامل یا معذوری سے بہتر اور قوی تر اسلوبِ بیان ہے۔

آپ نے صفحہ ۲۱۰ سے شروع ہونے والی غزل ریڈیو کے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے (بالفعل مشروط) تجویز کی ہے۔ اس میں بھی ایک شعر کا اضافہ ہے ؎

ہوش کی نامحرمی مشہور ہے — عشق کا محرم بناؤں کس طرح

۱۴ فروری ۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی — بغیر تاریخ کا خط ملا۔ پچھلے خطوط کے جوابات دے چکا ہوں امید ہے کہ مل گئے ہوں گے۔ آپ کی غزل پڑھی۔ جی خوش ہو گیا، پوری غزل مرصع ہے۔ اور ان اشعار کا تو جواب ہی نہیں :

جلوۂ فردا جو ہے مصروفِ آرایش ابھی — چہرۂ امروز سے ظاہر ہے اُس کا بانکپن
فرطِ غم سے ہجر میں اک آہ بھر لی تھی کبھی — آج تک ہر سانس میں محسوس ہوتی ہے جلن
آپ کا اثر

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ — ۲۹ نومبر ۵۴ء

پیارے نثار — ۲۶ نومبر کا خط ملا۔ مسرت ہوئی۔ میرا اس قابل ہے کہ اُس کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور نشاطِ روح و دماغ شعور وسیلہ بنایا جائے۔ میں نے اُس کا یہ شعر ایک مرتبہ رات بھر گنگنایا ہے۔ تصویر ایک مادی پیکر کی ہے۔ مگر ایک ایسے مادی پیکر کی گویا ایک تابندہ غیر مجسم ہو گیا۔ سنو اور اپنے تاثرات بیان کرو :

ے لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے — شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

کے ر غالب کا یہ شاہ پارہ بھی نہایت قابلِ قدر ہے ؎

خنداُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں — جس کے بازو پر تری[1] زلفیں پریشاں ہو گئیں

---

[1] مجھے یاد پڑتا ہے کہ دوسرا مصرع یوں ہے :۔ "تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں"۔ دیوانِ غالب (طاہر ایڈیشن) میں بھی یوں درج ہے ۱۲ نثار

اس میں سکون ہے - تیر کے شعر میں تڑپ ہے - غالب کو اپنے اور تیر کے درمیان حدِ فاصل بنا کر اپنا بھی ایک شعر سنانے کو دل چاہتا ہے - نہ معلوم پہلے لکھیں چکا ہوں کہ نہیں ؎

اُس کا عالم؟ اُس کا عالم! تم نے دیکھا ہے کبھی؟ وہ ستارہ جو "سحر افشاں" سراپا ہو گیا!

تیر کے بعض اشعار پر اپنے تاثرات قلمبند کر دو، یہی مضمون ہو جائے گا - اُس پر کتنا ہی لکھتے چلے جاؤ، معلوم ہوگا کہ کچھ نہیں لکھا - اِدھر مرض کی تکلیف پھر بڑھ گئی تھی - اب اچھا ہوں - زیادہ دُعا -

تمہارا اثر

کشمیری محلہ - لکھنؤ - ۱۷ مئی ۵۵ء

عزیزی سلمہ - تمہارا خط ملا - میں تم سے خفا نہیں بلکہ تمہارے خط کا منتظر تھا ... تمہارے استفسارات کا جواب مرسل ہے کسی رسالہ میں تمہارا مکالمہ[1] دل و دماغ و ضمیر کے متعلق پڑھا تھا - بہت پسند آیا - کاش اُس میں وہ جملہ نہ ہوتا جو خاتمے پر ہے - میرے مرض نے مستقل صورت اختیار کر لی ہے - صرف اتنا ہے کہ تکلیف کبھی کم ہو جاتی ہے کبھی بڑھ جاتی ہے - خدا کرے تم خیریت سے ہو -

اثر

مندرجہ مکتوب میں استفسارات کا اشارہ ہے، میں نے اپنے ایک زیرِ ترتیب مضمون کے لئے بعض الفاظ کے اِملا پر بحث کرنے کو اُن کا صحیح اِملا حضرت اثر سے معلوم کیا تھا اُن میں سے بعض الفاظ یہ ہیں :- موقع - موقعہ - ٹھہرنا، ٹھیرنا - دُہری، دوہری - ہندستان، ہندوستان - پردا - پردہ - وغیرہ - حضرت اثر نے ان میں پہلے اِملا کو صحیح بتایا - پردا، مزا، وغیرہ الفاظ کے لئے یہ حکم ہوا کہ بغیر عطف و اضافت کے پردا ورنہ پردہ - یہی حال مزا کا ہے غالباً اور الفاظ بھی ملیں -

کشمیری محلہ - لکھنؤ - ۲۵ مئی ۵۵ء

پیارے نثار - تمہارا کارڈ اور لفافہ دونوں ایک ساتھ ملے ..... میں نے تمہارا مضمون پڑھ لیا ہے - خوب ہے کہیں کہیں بعض الفاظ کی ردو بدل کر دی ہے - میر کا شاعری میں سید سعادت علی امروہوی کا شاگرد ہونا ایک پاور ہوا افسانہ ہے - ذکرِ میر میں صفحہ ۶۷ پر جس نے یہ سرخی قایم کی ہے " ریختے میں سید سعادت علی کی شاگردی " غلط قایم کی ہے - متن کتاب سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا ... برخوردن کے معنی شاگرد شدن نہ اُردو میں ہیں نہ فارسی میں - اصل عبارت یہ ہے :-

" بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود برخوردم - آں عزیز مرا تکلیفِ موزوں کردنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلیٰ بادشاہ ہندوستان دراں وقت رواج داشت کرد - خود کشی کردم و مشق خود بمرتبہ رساندم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم، شعرِ من در تمام شہر دوید و بگوش خورد و بزرگ رسید "

برخوردم کے معنی ہیں ملاقات ہوئی، شناسائی ہوئی اور صحبت موافق آئی اور اُن کے کہنے سے میں نے اشعار ریختہ کہنا شروع کیا - اسی صفحہ ۶۸ کی آخری سطر میں برخورد پھر صرف ہوا ہے - جملہ یہ ہے :- " رفتم و دیدم آدمیانہ برخورد و باخود رفیقم کرد " وہی صحبت کا موافق مزاج ہونا یہاں بھی مراد ہے - بہارِ عجم میں برخوردن کے جو معنی درج ہیں وہ بھی میری تائید کرتے ہیں -

برخوردن باکسے - ملاقات کردن و دوچار شدن و پیوستن و رسیدن بوے ..... میرزا صائب ؎

جاں تازہ می شود بلب روح پرورت — ہر کس کہ برخورد بتو از عمر برخورد

ولہٗ - ہر کس دُعا کند باجابت قریں شود — در ہر کجا بیکدگر احباب برخورند

ولہٗ - اگر بسوختگاں گرم برخوری چہ شود — کہ شعلہ نیز بتعظیم خار برخیزد

---

[1] میرا ایک مکالمہ جس کے کردار سب Abstract Noun تھے - یہ "ضمیر ہار گیا" کے عنوان سے رسالہ ساقی کراچی بابتہ اپریل ۵۵ء میں شایع ہوا ہے - خاتمہ کا جملہ یہ تھا :- " یہ میری ایک اخلاقی موت کا ذکر ہے " ! ۱۲

(یہ (صائب کے پہلے شعر میں) بَر بمعنی پھل ہے اور برخوردن از چیزے کے معنی ہیں پھل کھانا یعنی فایدہ اُٹھانا۔ منتفع ہونا۔ میر کی عبارت میں برخوردن از چیزے کا مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ برخوردن باکسے ہے۔ صائب کے شعر زیر نظر میں دونوں محاورے آگئے ہیں۔ اسی اُس کے آخری شعر میں بھی جو پشت پر (آگے) درج ہے۔ دونوں محاورے آگئے ہیں۔ برخوردن بمعنی منتفع شدن فارسی کے اس مشہور شعر میں بھی ہے:۔

خوشا روزے وخرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصلِ یارے)

ولی ؎ از تو تا دوریم ازما دور می گردد حیات — با تو چوں بَر می خوریم از زندگی بر می خوریم

محسن تاثیر ؎ برخورد امروز گرم با من، — ایں فیض زنشہ امیش بود

میر صاحب نے اپنے تذکرے نکات الشعرا میں انھیں سعادت علی کا حال رقم کیا ہے۔ کہیں شاگردی کا شائبہ بھی نہیں۔ عبارت یہ ہے:۔

"میاں سعادت علی از سادات امروہہ بود۔ مردے سلیم الطبع، کم سخن، متواضع، سعادت تخلص می کرد۔ فی الجملہ چاشنی درویشی داشت۔ شعر او خالی از لطف نیست با بندہ ربط بسیار داشت"۔

وہی "برخوردم" یہاں "با بندہ ربط بسیار داشت" ہے۔ کیا شاگرد اپنے استاد کے متعلق ایسی ہی عبارت لکھے گا۔ الغرض میر صاحب کی شاگردیٔ سعادت علی امروہوی افسانہ ایست و افسوں۔ اس کی کوئی شہادت موجود نہیں اور اس کی بنیاد برخوردم کے صحیح معنی نہ سمجھنا ہے ..... تمھارے چچا صاحب نے میر کے ایک شعر کے متعلق بعض استفسارات کئے تھے جن کا میں نے جواب دیا تھا۔ اسی مراسلت کا ذکر انھوں نے کیا ہوگا۔

اثر

مندرجہ مکتوب میں سید سعادت علی کا ذکر آیا ہے ان بزرگوار کے بارے میں اشارتاً پہلے لکھ چکا ہوں۔ برخوردن کے معنی فی الواقع صحیح نہ سمجھے گئے اور میری طرح دوسرے ترجمہ نگاروں کو بھی دھوکا کھانا پڑا۔ اور میر کی اس عبارت کے شاہد ہونے پر بھی مولانا امتیاز علی عرشی، جناب قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جیسے مستند ناقدوں اور محققوں کی رائے بھی حضرت اثر کی تائید میں ہے کہ میر نے خان آرزو کی بدسلوکیوں کو منہ چڑانے کے لئے سید سعادت علی اور میر جعفر عظیم آبادی کو ایسے ہی گھڑ لیا ہے جیسے غالب نے "بے استاد" کی پھبتی سے بچنے کو ملا عبدالصمد کی تخلیق کرلی تھی۔ ان حضرات کے سامنے میری ناقص رائے کیا وقعت رکھے گی! مگر دبی زبان سے اتنا عرض کروں گا کہ "آں عزیز مرا تکلیفِ موزوں کردنِ ریختہ ..... کرد" کا مطلب اب بھی باقی رہ گیا "تکلیف موزوں کردن" کے معنی بھی اُردو یا فارسی میں محض ترغیب دینے کے نہیں آئیں گے۔ اور میں پوچھوں گا کہ کیا سید سعادت علی کی شاگردی کوئی ایسا ہی بدنما داغ ہے جسے میر کے دامن سے ضرور دھویا جائے؟ میری رائے ابھی تک یہی ہے کہ خان آرزو ریختہ کے کچھ بہت اچھے شاعر نہیں تھے، ہاں فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ میر نے فارسی خان آرزو سے ضرور سیکھی ہے اور عین ممکن ہے کہ اپنا فارسی کلام جو اُنھوں نے ابتدا میں رواج زمانہ کے پیشِ نظر کہا تھا، خان آرزو کے سامنے ہی اصلاح کے لئے پیش کیا ہو اُن کا فارسی کلام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی دریافت سے کسی رسالہ میں چھپا تھا۔ بعد کو ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی کی معرکہ آرا تصنیف "میر تقی میر" (صفحہ ۳۰۴ - ۳۸۱) سے معلوم ہوا کہ نیرنگ، رامپور کے میر نمبر (۱۹۶۲ء) میں جناب عزیز لکھنوی نے میر کے فارسی کلام سے متعارف کرایا تھا۔ بہرکیف یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ لیکن یہ ہمیشہ ہوتی آئی ہے کہ ابتدائے مشق و موزونی کے زمانہ میں اگر کسی کمتر آدمی سے استفادہ کیا ہو تو بلند مرتبہ ہونے کے بعد اُس شخص کو چھپایا جاتا ہے۔ خود میاں مصحفی اپنے استاد کا نام نہیں بتاتے۔ حد ہے کہ لکھنؤ میں بیٹھ کر محض اس ڈر سے کہ لوگ مجھے اہلِ زبان نہ سمجھیں گے خود کو امروہہ کا نہیں کہتے آئیں بائیں شائیں کرتے تھے۔ عبدالقادر رامپوری سے کہدیا کہ میں بلم گڑھ کا باشندہ ہوں جو دہلی کے قریب ہے، اشعار میں:

"دلی کہیں میں جس کو زمانہ سے مصحفی ✧ میں رہنے والا ہوں اسی اُجڑے دیار کا" باندھ دیا۔

کسی سے اکبرپور متصل دہلی کہدیا۔ وجہ یہی نفسیاتی کمزوری ہے کہ میاں آتی ("سراپا سخن" کے مطبوعہ نسخوں میں آتی لکھا گیا ہے لیکن قلمی نسخوں میں ہر جگہ آتی ملے گا) بے چارے کون سے ایسے بڑے استاد تھے کہ مصحفی اُن سے رشتۂ تلمذ ظاہر کرکے سرخ رو ہو جاتے اور

دہلی و لکھنؤ کے مقابلہ میں اردو کو اپنی زبان کی سند کب تھا کہ اُسے اپنا وطن کہکر سرِ افتخار بلند کر لیتے!

تمام تذکروں میں سعادت کا مختصر ترجمہ ملتا ہے اور ہر جگہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے "اقران و امثال میں امتیاز تام رکھتے تھے۔ اُن کے اقران و امثال میں ایراغیرہ تھوڑئی تھے، آبرو، ناجی، یکرنگ، ضاحک، آرزو، ان استادوں کی ٹولی تھی اور اُن میں سعادت کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اُن کے کلام کو رواج زمانہ کے مطابق ایہام کے رنگ میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ آج اگر ذہنوں سے سعادت کا نام محو ہوگیا، اور اُن کی شاعری صفحۂ ہستی سے ختم ہوگئی کہ اُس میں زندۂ جاوید ہوجانے کے آثار نہ تھے اور زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہ تھی تو کیا اس کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ وہ اپنے دور میں بھی گئے گزرے رہے ہوں گے؟

اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحبِ اقتدار اور غیر معمولی عقل و فراست رکھنے والا ـــ اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جس کے صاف و شیریں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فایدہ اُٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا۔
ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنویں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈال کر بولی کہ "جو شخص اس کنویں کا پانی پیئے گا دیوانہ ہوجائے گا۔" صبح ہوئی سب نے حسب معمول اس کنویں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق سب دیوانے ہوگئے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا۔

جب یہ خبر شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ وار پھر پھر کر بہ آواز بلند کہنے لگے کہ "ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے ہیں ان میں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ان کو معزول کردیں۔"
شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہونچی تو اس نے حکم دیا کہ اُس کنویں کا پانی لایا جائے۔ چنانچہ ایک کاسۂ زریں وہ پانی لایا گیا۔ بادشاہ نے پانی لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور جو پانی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا۔
شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ رہِ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے۔

گزشتہ رات میں نے قدیم خیال کے دو عالم دیکھے جن میں سے ہر ایک دوسرے کی تحقیر کرتا تھا۔ ان میں سے پہلا کافر تھا اور دوسرا مومن۔
ایک بار یہ دونوں شہر میں جمع ہوئے اور اپنے اپنے انصار کے سامنے خدا کے وجود و عدم وجود پر جنگ کرنے لگے۔ جب مسلسل گھنٹوں تک لڑتے رہنے کے بعد وہ تھک گئے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ لی۔
اسی دن شام کو وہ کافر ہیکل میں گیا اور قربانگاہ کے سامنے اپنی دیوی کے حضور میں اپنے تمام گناہوں سے تائب ہوکر مومن ہوگیا۔
اسی وقت اس مومن عالم نے اپنی کتاب مقدس کی غلط تعلیم پیش کرکے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کا مذہب حد درجہ تنگ نظر ہے اور کافر و زندیق ہوگیا۔

حالی اور شبلی

(سوانح نگار کی حیثیت سے)

(ڈاکٹر سید شاہ علی)

اُردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز مغربی خیالات کے اثر کا نتیجہ ہے، جس کے علمبردار اُردو کے دو بہترین ادیب حالی اور شبلی ہیں حالی اور شبلی کے سوانحی تصانیف کے دیباچے بھی ان مغربی اثرات کے شاہد ہیں۔ خصوصاً اس نئی ڈگر کا سہرا مولانا حالی کے سر ہے۔ بقول پروفیسر سرور[1] انھوں نے سب سے پہلے جدید اُردو سوانح نگاری کو تذکرہ کی روش سے آزاد کیا۔ ان کی حیات سعدی کا دیباچہ گویا اُردو سوانح نگاری کا منشور (Manifesto.) ہے۔ اس میں انھوں نے یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے یہاں سوانح نگاری کی ابتدا و ارتقاء اور ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائیوں کے اولیاء شہدا اور مجتہدین کے تذکروں کی طرف اشارہ کرکے سترھویں صدی سے انگلستان میں اسکی ابتدا اور ترقی اور اُنیسویں صدی میں کئی کئی جلدوں میں مشاہیر کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالنے اور سوانح نگاری کے بھی تاریخ کی طرح فلسفے کی شکل اختیار کر لینے کا ذکر کیا ہے۔ مشرقی سوانح نگاری میں حالی نے سوا رجال اور حدیث کے اوروں کے حال میں درایت پر عمل نہ ہونے، نیز عربی فارسی میں سوا تاریخی شخصیتوں مثلاً سلاطین، وزرا، امرا وغیرہ کے کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے اور پھر سوانح نگاری کے اخلاقی فایدوں اور اس کے علم الاخلاق سے مقابلہ وغیرہ کے بعد اس کی یادگاری خصوصیات پر زور دیا ہے۔ شبلی نے بھی اسی انداز پر اپنی تصانیف خصوصاً دیباچوں میں اشارے کئے ہیں اور حالی کے اشارات کی مزید صراحت اور وضاحت کی کوشش کی ہے اور اپنے زمانہ کے اثرات کو اُجاگر کیا ہے چنانچہ ان دونوں مصنفوں کے یہاں اپنے زمانہ کے بُرے اور بھلے دونوں طرح کے اثرات اور رجحانات پائے جاتے ہیں جن پر آگے چل کر غور کیا جائے گا۔ ہم یکے بعد دیگرے حالی اور شبلی کی تصانیف کا جایزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ تصانیف کہاں تک سوانحی معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

جہاں تک حالی کے موضوعات کا تعلق ہے حالی کے تینوں موضوع اہم اور مشہور شخصیتیں ہیں جن میں سے دو ادیب اور شاعر ہیں اور ایک مصلح، دو ہم عصر ہیں اور ایک قدیم۔ اُردو کو مستقل اور باقاعدہ سوانح عمریوں سے روشناس کراتے ہوئے شاید حالی کو یہ ہمت یا توفیق نہیں ہوتی کہ وہ کسی غیر مشہور ہستی کو اپنا موضوع بناتے، گو حالی کی سیرت و کردار کے مدِنظر یہ زیادہ قرینِ قیاس اور مناسب ہوتا کہ وہ اپنی ہی طرح کے ایک نیک دل اور عافیت پسند انسان کی داستانِ حیات قلم بند کرتے۔ لیکن حالی سے شاید اس کی توقع قبل از وقت تھی کیونکہ اہم اور غیر اہم موضوع کے مسئلہ کو زمانۂ حال ہی میں خاطر خواہ اہمیت حاصل ہوئی ہے اور آج بھی یہ ایک حد تک معرضِ بحث میں ہے انیسویں صدی میں باستثنائے چند مغرب کو بھی اس کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہاں کی پچھلی سوانح عمریاں جانسن کی حیات سادرے (Savage.) اور کارلایل کی حیات اسٹرلنگ (Sterling) ممکن ہے ایک دوست کی دوسرے دوست کو نذرِ عقیدت کا نمونہ ہوں یا ذاتی پسند کا نتیجہ۔ اور لکھنے والوں کے ذہن میں خود بھی اس کا واضح احساس و شعور نہ ہو کہ وہ ایک بالکل نئی شاہراہ کی داغ بیل

---

[1] تنقید کیا ہے از آل احمد سرور مضمون یادگار حالی۔

ڈال رہے ہیں۔ یہ رجحان وہاں قومی سوانحی ڈکشنری (Dictionary of National Biography) کی اشاعت کے بعد خاص کر قوی اور نمایاں ہوا اور اس ڈکشنری کے کم مشہور موضوعات کی روز افزوں مقبولیت نے اسے اور تقویت بخشی، گو اس ڈکشنری میں بھی ان کے انتخاب میں کسی نہ کسی شعبہ میں امتیاز کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

غیر اہم موضوع پر طبع آزمائی تو دور کی چیز ہے اہم شخصیتوں کو اپنا موضوع تصنیف بناتے ہوئے بھی حالی کو معذرت کرنی پڑی ہے۔ چنانچہ حیات سعدی کے دیباچے میں انھوں نے سوانح نگاری کے فواید اور اچھے اثرات گنائے ہیں اور دوسرے ملکوں کی مثالیں پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح وہاں اپنے مشاہیر کے سوانح حیات سے ترقی کا سبق لیا گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے مشہور جرمن مصلح عیسائیت مارٹن لوتھر اور امریکی سائنس داں بن جامن فرانکلن کا نام بھی لیا ہے۔ یادگار غالب میں انھیں اس کا احساس ہوا ہے کہ ان کے موضوع کی حیات میں سوا شاعری کے کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہوا ہے کہ ان کے موضوع کی حیات میں سوا شاعری کے کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہوا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو براہ راست قوم و ملک کے لئے کارآمد ہو سکے، البتہ مخالف حالات میں اس کی زندہ دلی اور شگفتگی، اپنی پژمردہ سوسائٹی کے لئے مفید نظر آئی ہے اور اس عالی فطرت انسان کے کارناموں کی چھان بین اور نوادر افکار سے استفادہ قوم کے لئے ضروری معلوم ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک اندیشہ ان کے دل میں کھٹکتا رہا ہے اور خاتمے پر انھوں نے اس اعتذار کا سہارا لیا ہے کہ اگرچہ افادی نقطۂ نظر سے اس سوانح عمری کو اس عہد کی ضروریات میں شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی تصنیف پر ان کو عقیدت کی اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں ..... اور یہ کتاب ان کے مرزا سے تعلق بدوشعور یا معتقدانہ جوش عصبیت یا ایقان کمال مرزا کا نتیجہ ہے اور اقتضائے طبیعت کی وجہ سے لکھی گئی ہے۔[1] حالی کے سوانحی شعور اور تصور کی یہ عمدہ مثال ہے کہ انھوں نے حیات جاوید کے سلسلے میں کسی عذر کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اس کے برعکس وہ اسے سرسید کا احسان مانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش بہا نمونہ قوم کے لئے چھوڑا۔[2] بلکہ اس کی شکایت کرتے ہیں کہ ملک کے اخباروں نے "حیات جاوید" کی اشاعت کی قدر نہیں کی اور اس کا نوٹس نہیں لیا۔ البتہ ان کے تینوں موضوع مسلمان ہیں اور اس سے موضوعات کے انتخاب میں ان کا قومی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔

حالی کے موضوع ان تینوں شرائط کو بھی پورے کرتے ہیں، جن کو سر سڈنی لی (Sir Sydney Lee) نے ارسطو کی المیہ کی تعریف سے سوانحی موضوع کے لئے اپنایا تھا، یعنی عظمت، سنجیدگی اور تکمیل۔ حالی کے تینوں سوانحی موضوعوں کی عظمت پر ان کی زندگی کے بعد بھی کوئی حرف نہیں آیا۔ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ان کی مستعد اور سنجیدہ کوششوں کے متعلق بھی کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس کے بغیر حقیقی اور پائدار عظمت حاصل بھی نہیں ہوتی۔ تکمیل کے متعلق یہ کہ تاریخ تصنیف تک سعدی کی وفات کو صدیاں بیت چکی تھیں، غالب کے انتقال کو بھی ربع صدی گزر چکی تھی، سرسید کی سوانح عمری البتہ ان کی حیات ہی میں شروع کی گئی تھی لیکن اس کے ختم ہونے کے تین سال قبل وہ بھی موت سے ہم کنار ہو چکے تھے۔ لہذا تینوں موضوعات کے معاملہ میں سوانح نگار کو ٹھنڈے دل اور خارجی نقطۂ نظر سے ان کے حالات کا مطالعہ کرنے اور ان کو جانچنے کا موقع ملا تھا۔

اردو کے پہلے سوانح نگار کا سوانحی مواد بھی اول درجے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ صدیوں بعد 'سعدی' کے خطوط خود نوشتہ حالات یا انکی گفتگو کا پتہ چلانا محال تھا، خصوصاً اس حال میں کہ فارسی میں بھی سعدی کی کوئی مستقل سوانح عمری موجود نہ تھی، حالی نے ان کی شہرت و مقبولیت کے مدنظر ان کی حیات قلم بند کرنے کا ارادہ تو کر لیا مگر مواد کی کمیابی اور انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ یہ انھیں کی ہمت اور حوصلہ مندی تھی کہ ان حالات میں سیرت کی تدوین کو ناممکن سمجھ کر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کرکے ایک ایسی

---

[1] حیات جاوید۔ دیباچہ جلد اول۔ [2] ایضاً دیباچہ طبع ثانی

عمدہ سوانح عمری مرتب کی کہ مولانا شبلی جیسے کڑے نقاد کو بھی بے ساختہ داد دینی پڑی کہ یہ ایک دلچسپ محققانہ اور بے مثل سوانح عمری ہے، حالی کو متعدد فارسی تاریخوں اور تذکروں سے اکثر باتوں کا سراغ لگانے اور کلیات سعدی کی مختلف اشاعتوں کے دیباچوں اور سرگور اوسلی کے انگریزی تذکرۂ شعرائے ایران (اس میں بھی سعدی کے حال میں بہ قدرے تفاوت عام طور پر مروجہ نقل و حکایات اور تصنیفات کی اجمالی تعریف کے سوا ان کی واقعی خوبیوں اور عظمت کا ذکر نہ تھا) کے ناتمام اور غیر مستند حالات اور روایات کی درایت، صحیح اور معقول باتوں کے اخذ و انتخاب کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کرنے پڑے۔ شبلی کے سے ذہین مصنف کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ "جب تک کافی مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل[1] ہے۔

یادگار غالب میں حالی نے اپنی ذاتی واقفیت اور غالب کے دوستوں اور رشتہ داروں وغیرہ کی معلومات سے ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ لگانے کے علاوہ ان کی تصانیف کو اکٹھا کرکے ان سے بھی ان کے حالات اخذ کئے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت، خاندان، اصل و گوہر، سلسلۂ نسب، بچپن، عنفوانِ شباب، شادی وغیرہ کا حال انھیں تحریروں اور خطوں سے نقل کیا ہے۔ خصوصاً ان کے کئی بستے ہوئے اور مکالموں سے بھرے ہوئے اور دیگر نجی خطوط، ان کے لطائف و ظرائف، چٹکلوں اور گفتگو کی قسم کے خود نوشتہ مواد کے استعمال سے وہ کام لیا ہے کہ یادگار غالب کو ان کی اور اردو ادب کی مقبول ترین تصنیفات کی صف اول میں جگہ مل گئی ہے۔ چونکہ غالب کے کلام نظم و نثر میں بھی داخلیت کا عنصر غالب تھا، حالی نے ان کی تصنیفات سے اقتباسات کے علاوہ ان کے کلام کے انتخاب اور اس کی تشریح سے ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اشعار ان کی دلی کیفیات کی نمایندگی کرتے ہیں اور ان کی بعض خصوصیات مثلاً انفرادیت اور عظمت و امتیاز کے احساس، بتذل عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ اور باتوں سے نفرت دنیا سے بے زاری ابنائے زماں کی شکایت کو بار بار جھلکاتے ہیں۔

چونکہ حالی اور سرسید کا طویل ساتھ رہا اور ان کی معلومات کے ذرائع بھی وسیع تھے، حیات جاوید میں انھوں نے یادگار غالب سے بھی وسیع تھے، حیات جاوید میں انھوں نے یادگار غالب سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے سوانحی مواد کے مآخذ کی تقسیم کی ہے۔ چنانچہ ان کے خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت اور غدر کے پہلے کے حالات بعض رشتہ داروں، غلام نبی خاں کے فرمائشی رسالے، سیرت فریدیہ اور خود سرسید کی یادداشت کی مدد سے اور غدر کے بعد کے حالات جو زیادہ نمایاں ہیں اس سے زیادہ مفصل اور مستند ذرائع سے مثلاً علی گڈھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، سرسید کی تصانیف، خطوط، سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں، ان کے دوست احباب اور مدیران سلطنت کی تحریروں اور بعض دیگر معتبر مقامات سے، بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ اپنے تینوں موضوعوں میں حالی سب سے زیادہ انھیں سے واقف تھے لہٰذا مواد کی کوئی کمی نہ تھی، البتہ مناسب اور متعلقہ مواد کا اخذ اور انتخاب ضروری تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اب رہی یہ بحث کہ حالی نے اپنی سوانح عمریوں کے "بیان" میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ جہاں تک حیات سعدی ۱۹۰۱ء کا تعلق ہے یہ ایک حد تک خالص سوانح عمری کا نمونہ ہے اور اس کی بہت سی شرائط پوری کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ادیب کی حیات اس میں آسانیاں پیدا کرتی ہے۔ دونوں کو اخلاقیات سے دلچسپی تھی (اگرچہ سعدی کی تعلیمات زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں اور ان کا طریقہ سائنسی ہے، وہ حکایات منطقی دلایل وغیرہ سے کام لیتے ہیں اور حالی کے یہاں سرسید کے اثر کی وجہ سے درد قومی اور دلی سوزش کا احساس ہوتا ہے اور سعدی کے پیر و مرشد شاید ان پر اس قدر حاوی نہیں تھے جس قدر کہ حالی پر سرسید۔ سعدی کے زمانہ میں سلطنتیں کمزور تھے اور باوجود سلاطین اسلام کی علم و ادب کی سرپرستی کے (جس سے حالی محروم تھے) ان میں عیاشی بھی پیدا ہو گئی

---

[1] مقالات مہدی از مہدی حسن: حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک صفحہ ۳۲۶۔ [2] حیات شبلی صفحہ ۸۰۲

تھی ۔ حالی کے عہد میں مسلمان محکوم تھے صرف اخلاقی پستی دونوں میں مشترک تھی ۔ سعدی دُنیا دار تھے اور دنیا سے متمتع ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ اس زمانے کے رجحان کے مطابق اُن کی تصانیف میں رکاکت پائی جاتی تھی، جس کی رومی کی مثنوی معنوی (جسے ۶ ہست قرآں در زبان پہلوی، کہا گیا ہے) اور فی مافی میں بھی مثالیں ملتی ہیں ۔ حالی کے لئے دروغ مصلحت آمیز کا مشورہ ناقابل عمل ہوتا) سعدی اور حالی دونوں ادیب اور شاعر تھے اور نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ دونوں کی تصانیف کی ضخامت بھی عموماً ایک سی تھی اور دونوں کی شہرت کا دارومدار بھی ان کی چھوٹی چھوٹی لیکن عقل و نصیحت اور معلومات کی کان تصانیف پر تھا ۔ دونوں کے خیالات و کردار میں کافی حد تک مشابہت پائی جاتی تھی ۔ دونوں میں بلند خیالی، دُنیا سے بے پروائی، مشاہدۂ حیات، طالب علمانہ جذبہ، ذوق سلیم اور میانہ روی وغیرہ کا اثر ملتا ہے ۔ دونوں کا زمانے کی نبض پر ہاتھ تھا اور دونوں نظم و نثر میں جدید رجحانات کے نقیب تھے ۔ دونوں کا طرز اسلوب سلیس و سادہ اور رواں تھا، گو سعدی کے ہاں شعریت و فن زیادہ ہے اور حالی کے یہاں ناصحانہ انداز غالب ہے ۔ دونوں کے یہاں اختصار، معنویت اور چھوٹے چھوٹے جملے ملتے ہیں ۔ اس پر طرہ یہ کہ حالی فارسی شاعری کے دلدادہ تھے ۔ نہیں معلوم یہ حالی کی فارسی شاعری سے انتہائی دلچسپی کی وجہ سے تھا یا انکی افتاد طبع کے باعث کہ حالی خود کچھ حد تک سعدی کے سانچے میں ڈھل گئے تھے ۔ اگر بعض روایتوں پر اعتنا کیا جائے تو دونوں کی زندگی، اخلاق و عادات اور کارناموں کے علاوہ ان کی افتاد طبع، ڈیل ڈول، قد و قامت بلکہ متاہلانہ زندگی تک میں مشابہت نظر آئے گی، لیکن یہ روایتیں بے درایت ہیں ۔ یہ روایتیں صحیح ہوتیں تو حالی کے لئے حیات سعدی کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں آسانی ہوتی اور اندرے مرے کے نظریے کے مطابق وہ اپنے تجربات و محسوسات کی مدد سے بغیر زیادہ اندیشے کے قیاس کو کام میں لا سکتے تھے ۔ بہرحال حالی اپنی اخلاقی تصانیف کی وجہ سے "سعدی ہند" کہلائے ۔ لہٰذا سعدی کی سوانح عمری لکھنے کا ان سے زیادہ کس کو حق پہونچتا تھا؟ موضوع اور سوانح نگار میں شاذ مناسبت واقع ہوئی تھی ۔ اگر مواد بھی کافی ہوتا تو دُنیا کو ایک بہترین سوانح عمری مل جاتی ۔ یوں بھی سعدی کی موجودہ سوانح عمریوں میں حالی کی حیات سعدی بہترین سمجھی جاتی ہے ۔ پروفیسر سرور[1] کا خیال ہے کہ ان کا موضوع کا انتخاب عموماً مذہبی، اخلاقی اور قومی نقطۂ نظر سے ہوتا تھا اور حالی شخص پرست نہیں اصول پرست تھے، کیونکہ ان کے ماحول پر بھی رنگ چھایا ہوا تھا ۔ ہماری رائے میں اس انتخاب میں ان کی ذاتی پسند ادبی شغف، خیالات اور یادگاری جذبے کا بھی اسی قدر اثر ہے ۔ خالص مذہبی یا اخلاقی پہلو مدنظر ہوتا تو بہت سے ائمہ، اولیا اور انبیا موجود تھے، جن کو شبلی اور نثر نے اپنا موضوع بنایا ۔ یہ چیز قابل داد ہے کہ باوجود مغرب سے متاثر ہونے کے ماسٹر رام چندر یا ہندی اور بنگالی سوانح نگاروں کی طرح انھوں نے مغربی مشاہیر کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کی حقیقت پسندی نے اپنے ہمسایہ ملک کے جس سے ہماری زبان اور تہذیب کا گہرا تعلق ہے ایک نامور فرزند کو اس اعزاز کے لئے انتخاب کیا ۔

یہ البتہ سچ ہے کہ حالی نے جابجا اخلاقی طریقے پر بھی عمل کیا ہے مثلاً دیباچے میں علم اخلاق اور سوانح نگاری کا موازنہ اور مقابلہ کر کے سوانح نگاری کا موازنہ اور مقابلہ کر کے سوانح نگاری کی برتری اور افادیت دکھائی ہے اور حیات سعدی سے شعرا کے لئے بصیرت اور نصیحت حاصل ہونے کا بھی ذکر کیا ہے اور سعدی کے اقوال کی طرح طرح سے تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تصنیفات پر تنقید میں بھی اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر پر زور دیا ہے (مثلاً ہزل گوئی اور غزل وغیرہ کی بحث چھیڑی ہے ۔ بیواؤں، یہودیوں وغیرہ سے متعلق سعدی کے اقوال کو مذہبی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کی ہے) اس کے علاوہ زوال اسلام اور اس کے احیا، شخصی اور قومی آزادی وغیرہ کی بحث میں تاریخی اور سماجی طریق کی جھلک دکھائی ہے جو غلط ہے ۔ جبلی اور اکتسابی اثرات کی بحث اور سعدی کے ماحول اور اس کی شخصیت میں معاون عناصر اور فطری صلاحیتوں کے تجزیے میں سائنسی طریقہ کار کا رجحان بھی ملتا ہے ۔ مگر اس طرح کے مختلفہ اور سرسری رجحان سے شاید ہی کوئی تصنیف محفوظ ہو! چنانچہ ان کے الگ الگ خانے بنانے مشکل ہیں ۔ کسی حد تک ان مختلف عناصر کے امتزاج کی بھی ضرورت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجموعی طور پر حالی نے ایک فنی طریقہ کار پر

---

[1] Aspects of Biography by prof. Moverois.

عمل درآمد کی سعی کا ثبوت دیا ہے۔ گو انھیں اس میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔

حالی نے حتی الامکان معاصری تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گفتگو، خطوط، لطائف و ظرائف، سوانحی جزئیات کی تفصیلات وغیرہ کی توقع اس قدر مدت بعد نہیں کی جا سکتی تھی، لیکن مشرق میں اپنے غیر مذہبی مشاہیر کے حالات سے مجرمانہ غفلت کا یہ بھی ثبوت ہے کہ باوجود اس قدر شہرت اور مقبولیت کے حالی کو سعدی کے متعلق کوئی قرینے کا سوانحی مواد نہ مل سکا اور بقول مولانا عبدالحق[1] حالی کو شہد کی مکھی کی طرح کلام کے مطالعے سے ذرہ ذرہ چن کر سعدی کی سیرت اور اخلاق اور ان کے حالات کو ترتیب دینا پڑا۔[2] اس کوشش میں سرگور اوسلی کی طرح ان سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں۔ سعدی کی تصانیف سے ان کے خیالات و اخلاق کا قطعیت کے ساتھ پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ انھوں نے اکثر مسایل اور مباحث کے دونوں رخوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا ان کی تصانیف کو خود نوشتہ مواد کے طور پر استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ سعدی کے سفر حضر کے حالات، مجلسوں میں شرکت، سومنات کے واقعہ وغیرہ کے بیان میں اسی طرح کی لغزش کا احتمال پایا جاتا ہے۔ ٹامس ہارڈی نے بھی ایک مرتبہ اپنے سوانح نگار کے اس رجحان کی سخت مذمت کرتے ہوئے ایک ملاقاتی سے کہا تھا لوگ ایک مصنف کی کتابوں سے سوانحی اور نیم سوانحی حقایق کے اخذ کرنے میں احتیاط کیوں نہیں کرتے؟ ڈکنس کو ڈیوڈ کوپرفیلڈ کہتے ہیں جو وہ نہیں تھا۔ میرے سوانح نگار (Hedgehock ..) نے بھی ایسی ہی کئی غلطیاں میری تعلیم، بچپن، والد وغیرہ کے بارے میں کی ہیں اور میرے ناولوں کے کرداروں سے جو ایجاد محض ہیں، میری مطابقت کرنی چاہی ہے۔ خصوصاً (A pair of blue eyes) کے سمتھ سے۔ لیکن حیات سعدی میں باوجود کلام سے استنباط کی ان کوششوں کے سوانحی مواد بہت کم جمع ہو سکا ہے۔

حالی کی مجبوری سمجھ میں آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ حالی کی توقع کہ اس داغ بیل پر اور عمارتیں تعمیر ہوں گی پوری نہیں ہوئی اور ان کی تصنیف پر اب تک دنیا کی کسی زبان میں شاید ہی کچھ اضافہ ہو سکا ہو۔ شبلی کی حیات سعدی کی حیثیت ایک مضمون سے زیادہ نہیں ہے۔ شاید اسی نے انھیں یہ احساس دلایا ہو کہ بغیر مواد کے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے اور شاید وہ اسی لئے حالی کی حیات سعدی کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہیں اور ان کو ایک کنویں سے تشبیہ دیتے ہیں[3]۔ حالی کی محنت اور ان کی تصنیف کی مقبولیت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ حیات سعدی کے پچاس[4] سے زیادہ اڈیشن نکل چکے ہیں۔ حالی نے اس کی تلافی کی اس طرح کوشش کی ہے کہ اس مختصر کتاب میں تصانیف پر تبصرے کے لئے ڈیڑھ[5] سو صفحے گلستاں اور بوستاں ہی نذر ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ سوانح نگار کا کام نہیں ہے کہ اپنی تصنیف کو ادبی تنقید میں بدل دے۔ تصانیف پر نظر، موضوع کی شخصیت و کردار اور ان کی اہمیت و عظمت کے اظہار ہی کے لئے مناسب ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ تصانیف پر تبصرے کے لئے ایک الگ حصہ محفوظ کر دینا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر کارناموں پر تبصرے کا مقصد سیرت پر روشنی ڈالنا ہے تو شاید یہ اس طرح بہتر طور پر انجام پا سکتا ہے کہ زندگی کے تاریخی و تدریجی بیان میں اور کارناموں کے ساتھ تصانیف کا ذکر بھی، ان کے موقعہ تصنیف و خصائص وغیرہ کے ساتھ کیا جائے۔ اس سے موضوع سوانح کے دماغی شعور کی نشوونما اور پختگی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کی شخصیت اور خیالات کے ارتقا کا بھی۔

حیات سعدی کی موجودہ ترتیب ہمیں ان جدید تصانیف کی یاد دلاتی ہے جن میں کسی کی تصانیف پر تنقید یا کلیات یا دیوان کی اشاعت کے سلسلہ میں ابتداً مختصر سوانحی حالات بھی شامل کر دئے جاتے ہیں۔ حیات سعدی میں مواد کی کمی کی وجہ سے طوالت اور اختصار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اگر اس قدر تفصیل کے ساتھ سعدی کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کا اوروں کی تصانیف سے موازنہ اور مقابلہ نہ کیا جاتا اسکے علاوہ سعدی کے ذاتی حالات کے بیان میں زوال اسلام اور شخصی اور قومی آزادی کی بحث اور سعدی کو وزراء سلطنت کی الی امداد

---

[1] ہماری زبان - ۱۲ جون ۱۹۳۹ء مضمون خواجہ الطاف حسین حالی — [2] اردو سے مورد "Aspects of Biography"

[3] حیات شبلی صفحہ ۸۰۲ از ندوی [4] تذکرہ حالی از محمد اسماعیل ۱۱۲ تا ۱۱۳ -

کی تفصیل بھی نہ صرف غیر ضروری طور پر طویل ہے بالکل غیر متعلق بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید انتخاب و اجتناب کے اس فقدان کا باعث بھی مواد کی کمی ہی ہے، کیونکہ اس صورت میں کتاب میں رہ ہی کیا جاتا۔ (حالی نے بھی دیباچہ میں صرف اپنے حسن ترتیب کی داد چاہی ہے) یہ سچ ہے کہ انھوں نے مختلف روایات میں درایت سے کام لینے کی سعی کی ہے، لیکن اگر اس میں انھیں کامیابی ہوئی بھی ہے تو صرف جھوٹ سے سچ کا انتخاب کافی نہیں ہے بلکہ غیر متعلق سے متعلق اور ضروری کا انتخاب بھی لازمی ہے۔ مواد کی کمی کی تلافی تمام دستیاب مواد کی نقل سے نہیں ہوسکتی۔ اس طرح کتاب کے خاتمہ پر شیخ کے عام حالات اور اس کی شاعری پر اجمالی نظر بھی ایک ایسے طریقے کی مثال ہے جو پرانا ہے اور جدید سوانحی ترتیب کے خلاف ہے، جیسے اخلاق و عادات کا وہ باب جو قدیم سوانح عمریوں کے آخر میں علحدہ طور پر ملحق کر دیا جاتا تھا۔ لیکن حالی کے عہد میں یہی طریقہ رائج تھا، گربا سول اور لاک ہارٹ کے یہاں جو ان کے پیش رو ہیں اس کا پتہ نہیں۔ خاتمہ میں حالی نے کتاب کے مطالب کا نہایت عمدہ خلاصہ پیش کیا ہے اور سعدی کی زندگی پر خوب تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ[1] نے حالی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے سعدی کو بحیثیت انسان نہیں دیکھا اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر نہیں ڈالی۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ کسی کے متعلق کافی مواد موجود ہو۔ شاید انھوں نے اپنے اعتراض کی بنیاد حیات جاوید کے دیباچہ میں حالی کے اس اعتراف پر رکھی ہے کہ پہلی دو سوانح عمریاں غیر تنقیدی ہیں۔ اس کا علم حالی ہی کو ہوگا کہ انھوں نے سعدی کی کون کون سی مخرب اخلاق باتوں پر پردہ ڈالا ہے، اگرچہ کون سی ایسی بات ہوسکتی ہے جو حالی کو معلوم ہو اور دوسروں سے ڈھکی چھپی ہو جہاں تک ان کی پیش کردہ معلومات کا تعلق ہے، اس میں ہمیں ان کی انصاف پسندی کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے سعدی کی فلسفہ کی طرف کم توجہی، رزم کے بیان میں کچا ہونے، ہزل گوئی، سادہ رخوں اور امردوں کی جانب میلانِ خاطر وغیرہ کا صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سعدی کے بچپن، تعلیم و تربیت، جوانی، سیر و سیاحت، دانشمندی، فرزانگی، میانہ روی وغیرہ اور اسی مناسبت سے سلاطین، فاتحین، وزرا و امرا، وغیرہم کے نزدیک ان کی عزت و وقعت وغیرہ کا عمدہ نقش قاری کے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ مزید برآں بقول مولانا عبدالحق[2] اس میں خود حالی کی سیرت و شخصیت، اخلاق و جذبات کی جھلک نظر آنے کے علاوہ ہمیں ان کے بحیثیت ایک سچے ادیب کے سچی تہذیب و اخلاق کا نمونہ ہونے کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ حالی کی تحریر میں صفائی، سادگی، ہمواری، متانت اور وقار (عربی مقولے بھی) کے ساتھ ساتھ جو شاید عربی زبان و ادب، شیفتہ، سرسید وغیرہ کے اثر کا نتیجہ ہے، ان کی انسانی ہمدردی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ حالی کی نثر پر بعض لوگ خشک اور سپاٹ ہونے کا اعتراض کرتے ہیں جس سے اتفاق مشکل ہے۔ یہ ان کی تحریر کی پختگی کا ثبوت اور کمال ہے کہ مواد کی مشکلات کبھی ان کے بیان کی فطری سادگی اور اسلوب کی آسانی اور گاہ گاہ لطافت پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور اس میں ایک نرم روندی کی سی جو خاموشی کے ساتھ منزلیں مارتی ہوئی چلی جاتی ہے، روانی پائی جاتی ہے

یادگار غالب ۱۸۹۶ء کی تصنیف کے سلسلہ میں حالی نہ صرف ایک ادیب اور شاعر بلکہ غالب کے ہم عصر عزیز دوست اور شاگرد ہونے کے لحاظ سے وہ تمام شرائط پوری کرتے ہیں جو عموماً ایک سوانح نگار کے لئے ضروری اور مفید قرار دی جاتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے ان خصوصیات کا استعمال کیسے کیا ہے؟ شیفتہ کے مختصر تذکرے، سرسید کی آثار الصنادید کے باب چہارم اور آب حیات کے تذکرے سے قبل شاید ہی کسی نے غالب کی حیات پر روشنی ڈالی تھی موخر الذکر میں غالب کی حیات پر روشنی ڈالی تھی موخر الذکر میں غالب کی حقیقی عظمت کا اعتراف بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یادگار غالب، غالب کی اولین مستقل سوانح عمری ہے۔ بہ لحاظ سوانحی موضوع غالب کی شخصیت، اہمیت، انفرادیت وغیرہ کے سوانحی نظریات و تصورات کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ حالی کے غالب سے تعلقات بھی مواد کی فراہمی کے لئے بہت ہی مفید و معاون ثابت ہوسکتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جو غالب کی ایک طویل مبسوط اور مفصل سوانحی

---

[1] Urdu prose under the influence of Sir Syed, ed, Biogra -phy. ۱۹۴۹ء

[2] ہماری زبان - ۱۲ جون

کی طالب تھیں، حالی نے ایک مختصر سیرت لکھنے پر اکتفا کی، غالب کی حیات کو ضمنی حیثیت دی اور ان کے کارناموں اور ملکۂ شاعری کی وضاحت پر زیادہ توجہ صرف کی اور بحیثیت سوانح نگار اپنے فرائض کو پوری طرح ادا نہیں کیا۔ حالی نے خود کو ان چار چیزوں تک محدود رکھا ہے، جس پیرائے میں مرزا کا عجیب و غریب ملکہ ظاہر ہوتا تھا یعنی نظم و نثر، ظرافت و بذلہ سنجی، عشق بازی اور رند مشربی اور حسب اہلِ بیت اور بہ امید کی ہے کہ ان سے مرزا کی شاعری پر جو توبہ تو پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مرتفع ہونے میں مدد ملے گی، لیکن ان میں بھی سوا اول الذکر کے کسی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔

اس کی ہمیں بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کی عظمت ان کے زمانہ میں عام طور پر مسلم نہ تھی اور نہ ان کے طرزِ حیات کو لوگ پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ غالب کی زندگی گویا مذہب اور سماج کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ حالی نے اس معاملہ میں "ابنائے زمان کی فہم" کو مدِ نظر رکھا ہے اور پیغمبر اسلام کے اس قول پر عمل کیا ہے: "کہ ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق بات کیا کرو" حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ ابھی تنقیدی سوانح عمری لکھنے کا وقت نہیں آیا۔ حیات جاوید کے دیباچے میں انھوں نے اپنی پہلی دو سوانح عمریوں میں اپنے موضوعات کے پھوڑوں کو ٹھیس نہ لگنے دینے اور ملمع سازی کا جو ذکر کیا ہے وہ شاید زیادہ تر یادگارِ غالب ہی سے متعلق ہے اور مشرقی ذہنیت کا غماز ہے۔ چنانچہ 'حالی' نے غالب کے سرسری واقعات نقل کر دئے ہیں جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے رفاقت کے موقعوں سے فایدہ نہیں اٹھایا۔ ورنہ کم سے کم ان کو غالب کی حیات کے بدیہی پہلوؤں پر ضرور روشنی ڈالنی چاہئے تھی۔

'حالی' کے اپنے آپ کو زیادہ تر غالب کے ملکۂ شاعری تک محدود کر لینے کی مزید شہادت غالب کے ان اقوال کی نقل سے بھی ملتی ہے جو دیباچے اور متن کتاب میں نظر آتے ہیں اور شاید ایک حد تک ان کا مقصد تصنیف بھی ہیں:۔ "حیف کہ ابنائے روزگار حسن گفتار مرا نشناختند، مرا خود دل بر آنان می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرہ ایزدی نگشتند و از ایں نمایش ہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام سرگراں گزشتند" اور اس خیال کو اردو میں اس طرح ظاہر کیا ہے " میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان بادن برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا، اور زیادہ تر افسوس یہ کہ انسان فرہ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے۔ اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا گویا نظیری جنت آرام گاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے:۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

حالی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ حالی سے پہلے آزاد نے آبِ حیات میں اپنے استاد ذوق کے کلام کی خوبیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی، حالانکہ ذوق کو غالب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یادگارِ غالب کی تصنیف کی تحریک میں آبِ حیات کو بھی دخل ہے چنانچہ نہ صرف طریقۂ بیان بلکہ طرزِ تحریر سے بھی اس کا اثر صاف نمایاں ہے وہی 'آبِ حیات' کے سے لطائف و ظرائف، وہی شگفتہ اندازِ بیان یادگارِ غالب میں بھی موجود ہے۔ یادگارِ غالب کا نام بھی موجود ہے۔ یادگارِ غالب کا نام بھی اس بات کا شاہد ہے کہ حالی نے متاخرین کے لئے اپنے استاد کی حیات نہیں بلکہ یادگار چھوڑنی چاہئے۔

اس تمہید سے بعد یادگار کے سوانح پہلو (جو کچھ بھی وہ ہے) کی طرف توجہ مناسب ہوگی۔ مولانا حالی نے جن چار پیرایوں میں مرزا کے عجیب و غریب ملکہ کے اظہار کا ذکر کیا ہے وہ شاید کلام کے پیرائے ہیں کیونکہ انھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے مظاہر پر بالکل کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مثلاً غالب کی حیاتِ معاشقہ کا کھلے بندوں اعتراف ان کے خطوط اور کلام سے صاف ظاہر ہے۔ اپنے جوانمرگ محبوب کے مرثیے کے علاوہ جسے اپنے کلیات میں شامل کیا ہے غالب نے خود کہا ہے:۔ "ننگ پیری ہے جوانی میری"۔ حالی نے غالب کے جو خط حاتم علی مہر کے نام طرزِ تحریر کی مثال کے طور پر نقل کئے ہیں ان سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب (مغل بچوں کی روایت برقرار

رکھنے کے لئے) کا ایک صید نظر مرتے مرتے اپنے صیاد کو بھی بسمل چھوڑ گیا ہے، بلکہ غالب کے نظریات حسن کی بھی وضاحت ہوتی ہے، جو انھوں نے کچھ اس قسم کے صدمات اور تجربات کے بعد اختیار تو کئے ہیں، بلکہ ابتداءً شروع سے اپنے ہمعصروں سے حاصل کئے ہیں، چنانچہ اس صیاد بسمل کی شہد کی مکھی بننے، اور

زن نوکن ہے دوست در ہر بہار کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

اور چنا جاں نہ سہی، منا جاں سہی کی ہدایت عجیب سی لگتی ہے۔ ممکن ہے یہی تنوع پسندی (وہ نہ مردیں کاخ طوبیٰ کی شاخ اور صرف ایک حور کے خیال ہی سے گھبراتے تھے) ان کی اپنی بیوی سے بیزاری کا باعث بھی ہو، جس طرف انھوں نے اپنے خطوط، ملاقات اور متعدد فارسی قطعات (زنِ بدخو) میں اشارے کئے ہیں۔ ان کا اپنی قبل از وقت بیڑیوں او دام سخت پنہاں تھا ..... (اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے) سے نجات حاصل نہ ہوسکنے کا ماتم اس قدر شدید ہے کہ ہم حالی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرسکتے کہ "یہ بھی ان کی شوخی اور ظرافت کا ایک مظہر تھا جسے ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کرسکتا ہے" غالب کی اور ان کی بیوی کی افتادِ طبع کا فرق، غالب کی آزاد خیالی اور طبعی لچک اور ان ان کی بیوی کی رجعت پسندی اور کٹ ملاپن (جو اپنے شریک حیات کے برتن الگ رکھنے کا باعث ہوا تھا) دو تقریباً متضاد اور غیر متجانس چیزیں تھیں، جن کی وضاحت یا اعتراف ضروری تھا یا کم از کم ایسی تاویل نامناسب تھی۔ اسی طرح ان پر اپنے بھائی سے سرد مہری کے الزام کی تردید بھی، ان کی افتادِ طبع، اور غدر کی مجبوریوں وغیرہ کے مدنظر، ممکن تھی دوستوں سے خلوص (فرغل اور چغہ کا تبادلہ) خط و کتابت میں پابندی، غدر میں پنشن بند ہونے کے زمانہ میں بھی ملازمین و متوسلین کی بار برداری وغیرہ ایسی معلوم اور مسلم باتیں ہیں کہ ان کے مدنظر مذکورۂ بالا الزام بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ناقدر دانی کی شکایت بھی ان کی تنگ ظرفی کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے دل و دماغ کی بے پناہ وسعتوں اور صلاحیتوں کے مدنظر جن کے اظہار کی خلش ان کو بے چین رکھتی تھی اور ان کی قرار واقعی داد نہ دی جانے (ملک الشعرائی اور بادشاہ کی استادی کا شرف بھی نہیں) اور ان کے کمال سے ہم عصروں کے انحراف وغیرہ کی وجہ سے تھی اور ان کی غمگینی انسان کے ابدی احساس رنج و الم کی داستان تھی، جو انسان یا حالات کی یا خود اپنی بے راہ روطبیعت کی بیداد کے مقابل بے بسی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی بے اعتنائی کے علاوہ ان کے اپنے سات بچوں کی پے در پے وفات، بیوی سے تعلقات، مالی مشکلات، جذبۂ رشک وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جو مجموعی طور پر انسان کو غمگین و اداس رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ حالی نے اس کی تشریح کے برعکس کبھی تو ان کی ناقدری کے ذکر میں اس زوال پذیر دور میں یوسف کی خریداری کے لئے ایک سوت کی انٹی کو بھی غنیمت (ص ۴۴) اور سرکار ظفر سے پچاس روپے ماہوار کو نہایت قلیل بتایا ہے۔

حالی نے غالب کی ظرافت اور بذلہ سنجی کے معاملہ میں بھی کنجوسی سے کام لیا ہے اور اس عذر پر کہ ان کے لطائف و ظرائف کے لئے ایک مستقل رسالہ چاہئے ان کو سب کا سب ان کی یادگار میں درج کرنے سے احتراز کیا ہے اور اردو ادب کو ان سدا بہار پھولوں سے اور غالب کے سوانح نگاروں کو ان کی شخصیت کے مزید تجزیے کے مواقع سے محروم کردیا ہے جو در اصل اصول سوانح نگاری سے مکمل واقفیت نہ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس پر مزید بحث حیات جاوید کے سلسلہ میں آئے گی۔ حالی نے باقاعدہ ترتیب کے تحت غالب کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے مثلاً غالب کی خودداری کی مثالیں مختلف جگہوں پر منتشر ملتی ہیں، مثلاً دلی کی سرکاری ملازمت کا معاملہ، لکھنؤ میں نذر دینے سے انکار، قیس فیروزپور کے ذریعہ وظیفہ لینے سے انکار وغیرہ یا[1] مثلاً آگرہ، دہلی، لکھنؤ اور کلکتہ کے قیام کے الگ الگ تفصیلی حالات بھی نہیں ہیں اگر مولانا حالی نے تاریخی ترتیب پر عمل کیا ہوتا تب بھی ٹھیک تھا لیکن اس طریقہ کا بھی ثبوت نہیں ملتا۔

---

[1] "یادگار غالب" از ڈاکٹر عبداللہ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۵ء

جس سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی رجحانات کی بدرجہ تبدیلیوں اور ارتقا کا پتہ چل سکتا۔ غالب کے مختلف اشخاص سے خلوص و دوستی کے اظہار اور ان کی ہرمز یا عبدالصمد کی شاگردی کے ذکر میں بھی تضاد پایا جاتا ہے، جس کی وضاحت حالی کے لئے آسان تھی۔ کلام کی ترتیب بھی تاریخی نہیں کی گئی ہے اور غالب کی آگرہ کی زندگی کے متعلق بھی سوا ایک مراسلے سے اقتباس کے کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن حالی کا تعارف غالب سے اس وقت ہوا تھا جبکہ غالب کی زندگی کی شام تھی اور یا تو ان کی سنجیدگی اور متانت نے یا یادگار کی بعد از وقت تصنیف نے انھیں خود غالب یا دیگر واقف کاروں سے استفسار کا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی سوانح نگار کو ذہنی پابندیوں اور رکاوٹوں سے آزاد ہونا چاہئے عموماً اس کی عقیدت یا پسندیدگی موضوع کے ساتھ تعلقات میں اسے غلط احساس خودداری سے آزاد کر دیتی ہے، ورنہ جس چیز کو وہ خود نہ سمجھ سکے اوروں کو کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ حالی نے کہیں کہیں اپنی انصاف پسندی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً برہان قاطع کی پہلی اشاعت کی خامیوں فارسی آمیز اردو اشعار کی کوتاہیوں، تقریظوں وغیرہ کی الجھی ہوئی اور پیچیدہ زبان وغیرہ کا ذکر کیا ہے (لیکن غالب کی مناظروں اور مجادلوں میں زیادتی کا ذکر نہیں ہے)۔ علاوہ بریں غالب کی غذا، لباس، انفرادیت وغیرہ قسم کی معلومات اور جزئیات بھی پیش کی ہیں لیکن یہ بہت کم ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب باتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اتفاقاً یا من مانے طور پر پیش کی جا رہی ہیں، یا ہم کسی مرد خسیس کے شریک دسترخوان ہیں جس سے بجائے بھوک مٹنے کے اشتہا میں اور اضافہ ہوتا ہے، بہرحال غالب کا یہ تذکرہ حالی کے رفاقت کے موقعوں اور گہرے تعلقات کے مدنظر سرسری اور سطحی ہے اس کا ذمہ دار کسی حد تک ان کا بالواسطہ طریقہ ہے جس میں مختلف عنوانوں کے تحت بعض اپنی دانست میں ممنوعہ باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً وہی غالب کی عشق بازی اور رند مشربی کا ذکر طرز تحریر کی مثالوں میں ص ۵۸ اور ۱۷۰ پر ان کے خطوط کے اقتباسات جن میں اپنے "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے دعاوی" لیکن خود ننگا بھوکا ہونے، اور بقائے عام اور شہرت دوام، پیغمبری و شاعری اور دنیا کے کمالات کے موہوم ہونے کا ذکر ہے جس سے غالب کی عظمت و وسعت خیال کا احساس ہوتا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام لکھتے ہیں "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فایدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے، باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا، دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم ہے اے یار عالی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بیرنگی میں گزر جاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے، ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔" (یادگار غالب ص ۱۷۰)

بقائے عام اور شہرت دوام، حرص و ہوس اور زندگی کی موہوم چیزوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے کھوکھلے پن کی اس سے زیادہ پردہ دری اور مذمت کیا ہو سکتی ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ باعظمت انسانوں کے خیالات ہمیشہ ایک سے رہے ہیں یہ بنیادی باتیں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ غالب کے یہ خیالات صرف اپنی ناکامی کی تلخی یا شاعرانہ خیال آرائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کافی مدت تک شعور و احساس اور بلند خیالی کے شاہد ہیں۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔ "قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو وداع میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتوان، بیمار، نکبت میں گرفتار، میرے معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو،

وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔" (ص ۵۸ یادگار غالب)

ان الفاظ میں شخصیت کی جو بے پناہ وسعت و رفعت کا ثبوت ملتا ہے وہ دنیا میں شاذ ہے۔ یہ محض غالب کی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ اپنے دوست کے چھینٹ کے فرغل کو پسند کرکے اپنا مالیدہ کا چغہ نذر کرنا اور خلعت بیچ کر چپراسیوں کو انعام دینا اس کے شاہد ہیں۔ کچھ حد تک یہ بھی ہے کہ آزاد خیال غالب اور مشرقی تہذیب و تمدن کے نمونہ حالی کے جذبات و خیالات اور اقدار حیات میں بھی تقریباً وہی فرق اور بعد ہے جو غالب اور ان کی بیوی میں تھا۔ یہاں حیات سعدی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار یا حیات جاوید کی طرح، اپنے موضوع کی وکالت نہیں مقصود ہے بلکہ اپنے شاعر کی استادی کو منوانا ہے جس میں شخصیت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا کیونکہ شخصیت مورد اعتراض بن سکتی تھی اور اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ حالی کو باوجود کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کے اپنے مقصد میں پوری، بلکہ ان کی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ حالی خود غالب کی شاعری کے مستقبل سے مایوس سے، لیکن آج کی غالب کی مقبولیت اور ان کی عظمت کا (ع شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن) سنگ بنیاد انھیں کا رکھا ہوا ہے۔ آج غالب کی متعدد سوانح عمریاں اور شرحیں، یادگار غالب ہی کی مرہون منت ہیں۔

حالی سے غالب کے نفسیاتی تجزیے کی توقع بیجا ہے، اور نہ غالب کو محب قوم و ملک نہ ہونے کا الزام دیا جاسکتا ہے۔ یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ غالب کی قومی ہمدردی زیادہ سے زیادہ غدر میں مسلمانوں کی مظلومی اور اس سے خود اپنے متاثر ہونے پر تعجب کے اظہار تک محدود ہے، جو ممکن ہے انفرادی اور اجتماعی مظلومی اور اس سے خود اپنے متاثر ہونے پر تعجب کے اظہار تک محدود ہے، جو ممکن ہے انفرادی اور اجتماعی مظلومی اور بے بسی کے احساس کے تحت اپنی ہی ہمدردی کے مترادف ہو لیکن آج کے سوانح نگار بھی باوجود مغربی علوم سے بہتر واقفیت کے غالبیات میں کوئی خاص اضافہ نہ کرسکے ہیں اور بقول اکرام "غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے قریباً قریباً نابلد تھا یعنی حالی"[1]۔ لیکن وہ کیا چیز ہے جس نے یادگار غالب کو باوجود اس کے کہ وہ حیات اور تصانیف کے نمونے پر ہے اور اس کا سوانحی حصہ ایک طویل دیباچہ کی طرح ایک چوتھائی حصہ سے کم (۹۲ صفحے) ہے اور اس میں بھی اخلاقی طریقے پر عمل کرکے غالب کے ان مسایل حیات کو جو آج معرکۂ آرا بنے ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو قتیل اور غالب اور قاضی عبدالودود کے مضامین وغیرہ) واضح نہیں کیا گیا ہے، حالی کی اور اردو ادب کی ایک مقبول ترین تصنیف بنا رکھا ہے۔ یہ زیادہ تر غالب کی دلکش شخصیت اور اس سے زیادہ ان کے خود نوشتہ مواد کی عمدگی ہے، جو یادگار غالب کی دلچسپی، مقبولیت اور شگفتگی کا باعث ہے۔ ادیبوں کی حیات کی خوبی یہ ہے کہ ان کا خود نوشتہ مواد بھی ادبی حیثیت رکھتا ہے اور سوانح نگار سے عموماً صرف انتخاب و ترتیب کی صلاحیت چاہتا ہے۔ ادبیت کی وجہ سے اس میں مختصراً ہی سہی وہ تمام سوانحی مواد آگیا ہے جو ان کی خود نوشتہ تحریروں اور گفتگو سے اخذ کیا جاسکتا تھا چنانچہ غالب سے متعلق ہر نئی تصنیف کو اسی مناسبت سے مقبولیت حاصل ہوگی جس مناسبت سے اس میں غالب کی رنگا رنگ شخصیت کے بارے میں نئے مواد یا معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے نئے مواد کی مقدار کیا ہوگی۔ بقول مولانا شبلی عموماً،

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

والا معاملہ ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود معدودے چند اعتراضات کے غلام رسول مہر کو اپنی تصنیف میں نہایت فراخ دلی سے یادگار غالب ہی سے اقتباسات دینے پڑے۔ اکرام اپنے اس فیصلہ میں حق بجانب ہیں کہ "گو ڈاکٹر لطیف کے بقول یادگار غالب میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن ابھی تک کوئی تبصرہ ایسا نہیں شایع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں"، اور یہ کہ "یادگار غالب، غالب کی سب سے منصفانہ

---

[1] غالب نامہ ص ۸

سوانح عمری ہے۔" اگر حیات جاوید کی غیر ضروری تفصیل قاری کی طبیعت پر گراں گزرتی ہے تو یادگار غالب کی شہد و شراب کی خست اسکی تشنہ لبی کو اور بڑھا دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کے سوانح نگار نے جو اپنے موضوع کو اس طرح جانتا تھا جس طرح شکسپیر ہیملٹ کو، یعنی جس سے اس کے کردار کا کوئی پہلو چھپا نہ تھا (اپنے موضوع کے معلوم لطائف و ظرائف کو بھی قلم بند نہ کر کے) اپنے رفاقت کے سنہری موقع سے فایدہ نہ اُٹھا کر اور مشرقی رکھ رکھاؤ اور تہذیب و نفاست اور اپنی طبعی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے اپنے موضوع کے حالات پر تالا لگا دیا اور اس کی کلید سے دنیا کو محروم کر دیا اور ایک ہو بہو تصویر کی بجائے "اہل وطن کے لئے مفید نصیحتیں" (خاتمہ) اخذ کرنے کی طرف مایل ہوا۔

اپنے موضوع اور اس کے خوہ نوشتہ سوانحی مواد کی عمدگی اور شگفتگی نے (اور شاید آب حیات کے نمونے نے) حالی کے انداز بیان پر بھی اسی طرح اپنا اثر دکھایا ہے، جس طرح آب حیات میں حالی کے نوشتہ مومن کے حالات کو، آزاد کے موئے قلم کے اثر نے انھیں کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس کے علاوہ حالی کی غالب سے عقیدت، ان کا خلوص، ان کا ذوق سلیم، ان کا اعتدال و انصاف (لطیفہ وچنوری کے برعکس) اور میانہ روی، کسی حد تک ان کے ایجاز و اختصار، ان کی سخن فہمی اور غالب کے کلام کی لفظی و معنوی، ظاہری اور باطنی خوبیوں کی وضاحت (غالب کے صحیح مقام کا تعین) اور سب سے بڑھ کر خود حالی کی نیک اور خوش صفات شخصیت نے بھی جو ان کی تحریروں سے نمایاں ہے، (اگرچہ خود کو ہمیشہ پس منظر میں رکھا، چنانچہ اپنی نماز کی تلقین کے ذکر میں بھی وہ انکسار) غالب، یادگار غالب اور خود حالی کو جاوداں کر دیا ہے۔

۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۱ء حالی کو اُردو کا اولین اور بہترین سوانح نگار اور حیات جاوید کو ان کی کامل ترین سوانحعمری **حیاتِ جاوید** قرار دیا گیا ہے۔ اس تصنیف کی بنا پر حالی کو باسول اور مورلے سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کی رفاقت، سوانحی مواد کی فراوانی، برسوں سے ان کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور سعی (حالی نے اسی وقت سرسید کو ایک سوال نامہ مرتب کر کے دکھایا تھا جب کہ سرسید کو کالج کی بنیاد رکھے کچھ ہی دن ہوئے تھے اور لوگوں کو پوری طرح ان کی عظمت کا احساس نہیں ہوا تھا بقول حالی وہ پہلی رات کے چاند کی طرح تھے کہ کسی نے دیکھا تو کسی نے نہیں) ہر چیز انھیں اس کا استحقاق اور موقع عطا کرتی تھی کہ اسے ایک لازوال شاہکار کی شکل دیں۔ اُردو کے ایک عظیم ترین ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حالی کو کم سے کم پچیس سال تک سرسید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے سرسید کو نہایت قریب سے دیکھا، ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، ملازمت کی مجبوریوں کی وجہ سے، سرسید کے عزیز ترین دوست محسن الملک کو بھی ان کی سیرت و کردار اور کارناموں کے اتنے قریبی مطالعہ کا موقع نہیں ملا ہوگا جتنا حالی کو۔ حالی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سرسید کو بحیثیت عملی انسان کے بے حد پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حالی اپنی طبعی شرافت و رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کا انکسار اور ان کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ ان کے دل و دماغ کے پٹ کھلے رکھنے کا باعث ہوا تھا۔

حالی اس سے پہلے دو سوانح عمریاں لکھ چکے تھے جو ملک و قوم میں مقبول ہو چکی تھیں ان تصانیف کے دیباچوں میں فنِ سوانح نگاری کو اُردو ادب سے متعارف کرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ آب حیات کی مقبولیت بھی ان کو تذکروں کی "قدیم روش" کی طرف مایل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ حیات جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد ان کے سوانحی شعور میں بھی کافی ترقی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے حیات جاوید کے دیباچہ میں اس کا صاف اعلان کیا ہے کہ ان کی پچھلی دو سوانحی تصانیف کے برعکس وہ اس میں اپنے موضوع کا کھرا کھوٹا ٹھونک بجا کر دیکھیں گے کیونکہ ان کا موضوع خود اس رجحان کا بانی ہے (حالی نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ سرسید کی مختلف الجنس حیثیتوں کے مدنظر سوانح نگار کو بھی ایسا ہی جامع حیثیات ہونا چاہیے تھا

جیسے کہ سرسید تھے۔ ہم فن سوانح نگار کے زیر عنوان پہلے باب میں اس سے اختلاف کر چکے ہیں) ایک جگہ[1] سرسید کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انسان کے منتہائے کمال کی دلیل عیبوں سے پاک ہونا نہیں عیبوں کا کم ہونا ہے اور باوجود بے شمار خوبیوں کے اور حیرت انگیز اوصاف کے سرسید میں اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا ان کی اعلیٰ درجہ اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دال ہے"۔ انھیں نجی خطوط اور تقریروں کی اہمیت کا بھی احساس ہے، اس کے پرائیوٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہم راز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جنھیں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ ان سے اس کے دل کی فنگی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اسکے ذاتی خیالات روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہو جاتے ہیں"۔ وہ حتی الامکان خود نوشتہ طریقہ پر بھی عمل کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کے پھوڑوں کو دنیا سے ڈھکنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ موروثی واکتسابی، نسبی اور خاندانی تفصیلات کی بحث کی مدافعت کرتے ہیں اور اسے انسان کی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار و معاون بتاتے ہیں۔ مغربی طریقہ سوانح نگاری کے انداز پر وہ سرسید کی حیات اور شخصیت میں ماں کی تربیت، سیاست، مذہب، شادی، بیوی کی وفات وغیرہ مختلف اثرات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرسید کی جسمانی اور دماغی قابلیت کو دو اجنبی خاندانوں میں پیوند ازدواج کا نتیجہ بتاتے ہیں جو ان کی عمرانی علوم سے واقفیت کا ثبوت ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن حیات جاوید میں کچھ ایسی خامیاں بھی ہیں، جنھوں نے اسے سوانح نگاری کا ایک کامل نمونہ ہونے سے محروم کر رکھا ہے۔

یہ سچ ہے کہ سرسید کی شخصیت کی عظمت ان کی طویل اور پر از واقعات زندگی، مواد کی فراوانی اور کسی باقاعدہ سوانح عمری کی عدم موجودگی کے مدنظر، سرسید کی ایک مفصل اور جامع سوانح عمری کی ضرورت تھی لیکن حالی کا طبعی اعتدال اس کی ضخامت کے معاملے میں کام نہ آسکا۔ حالی نے مولوی سراج الدین کی سرسید کی سوانح عمری کے مواد کو اپنی تصنیف میں شامل کر لیا تھا۔ کرنل گراہم کی لکھی ہوئی سوانح عمری سے بھی استفادہ کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی عظمت حالی کی ہمعصری، دوستی رفاقت اور مستند مواد کی فراوانی ہی ان کی سب سے بڑی دشواری کا باعث ہوئی (جس کی طرف انھوں نے خود اپنے دیباچے میں اشارا کیا ہے) اور ان کی قوت امتیاز و انتخاب کو اپنی رو میں بہالے گئی۔ حالی نے اپنے سوانحی مواد کو کتابی شکل دینے میں سات سال صرف کئے تھے اور سرسید کی وفات کے بعد بھی تین سال تک اس میں لگے رہے تھے، لیکن ان کی سرسید سے عقیدت ان کی موت کے بعد بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہوگئی۔ اسکے علاوہ انھوں نے نہ صرف سرسید کی سیرت نگاری کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا بلکہ اس جامع حیثیات شخص کے کارناموں کی توضیح و تشریح کا مشن بھی اپنے آپ پر عاید کر لیا تھا جو ممکن ہے کرنل گراہم کی سوانح عمری کے اثر کا نتیجہ ہو، کیونکہ اس میں بھی سرسید کے کردار اور کارناموں سے بحث کی گئی۔ گویا "حیات جاوید حقیقی معنوں میں سراج الدین احمد، کرنل گراہم اور خود حالی کی مختلف کوششوں مجموعی امتزاج تھی۔ حالی نے انیسویں صدی کے حیات اور زمانے اور حیات اور تصانیف کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ اصلاحی تمدن کی تاریخ (اور مسلمانوں کے احیا اور اصلاح کی کوششوں کی روداد) کو بھی اپنی تصنیف میں شامل کر لیا۔ سرسید کی حیات کے قوم اور ملک کی حیات سے منسلک ہونے کی وجہ سے فرد اور سماج کے اصول کے مدنظر، یہ پس منظر کچھ بے جا نہ تھا، لیکن جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ حالی نے اس کام کو پورا کرنا چاہا اور جس طرح تمام جزئیات و تفصیلات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، اس نے ان کے عزیز مقصد ہی کو فوت کر دیا، یعنی غلط فہمیوں کے ازالے کے انھوں نے جو زحمت اٹھائی تھی وہ کتاب کی ضخامت کی وجہ سے شرمندۂ معنی نہیں ہوئی۔ حالی کی ادبی صلاحیتوں اور نکتہ کاری کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے اپنے سوانحی مواد کو سمیٹنا محال نہ تھا (گو بقول عبداللہ اس کے لئے ایک ادبی حلقہ کی ضرورت تھی) لیکن سوانح عمری کی دو حصوں میں توسیع جو غیر ضروری اعادے کا باعث ہوئی اور ان کی اپنے دوست اور رہبر کی ہر چیز کسی تشریح اور صفائی میں سرگرمی اس کے آڑے آئی۔ اس سے انکار نہیں ہے کہ ایک طویل سوانح عمری میں اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی قابل ذکر بات چھوٹنے نہ پائے۔ اگر حالی انتخاب واقعات میں اصلاحی پہلو

---

[1] حیات جاوید ص ۲۳۵

مدنظر رکھتے اور دوسرے اپنے تبصرے، بحث اور اظہار رائے کی بجائے وہ صرف بیان حقایق پر اکتفا کرتے تو شاید اتنی طوالت نہ ہوتی۔ لیکن یہ چیز سرسید کے کارناموں اور خدمات کے حالی پر انتہائی اثر کی وجہ سے تھی، جو اس تصنیف کی اشاعت پر اپنے بیٹے کے نام خط سے بھی جھلکتی ہے۔ "خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہوگیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجایش نہ رہی کہ جس نے قوم کی ایسی خدمات کیں، قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی"۔ اگر قومی خدمات ہی کے مدنظر سوانح عمری لکھی جانی تھی تو یہ فطری تھا کہ ان قومی خدمات کی بھی وضاحت کی جاتی لیکن یہ کام واقعی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک شخص ہی کا ہوسکتا تھا اور حالی کے لئے اس قسم کے لحوظات مناسب نہ تھے۔

ایک عذر حالی کی طرف سے یہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کا تعارف سرسید سے اس وقت ہوا تھا جب کہ سرسید کی حیات کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور ان کی شخصیت کے ڈھلنے کا زمانہ گزر چکا تھا۔ حالی کا سرسید کی زندگی کے آخری حصے پر زور دینا مناسب بھی تھا کیونکہ وہی ان کے براہ راست مشاہدے میں آیا تھا۔ انگریزی ادب میں اس کی ایک روشن مثال ہمیں باسول کی حیات جانسن سے اس کی عمر کے آخری حصہ میں ہوا تھا۔ روزنامچوں اور دیگر تاریخی شواہد اور دستاویزات کی بنا پر باسول کے جانسن سے تعلقات اور اس کی صحبت کی میعاد دنوں اور گھنٹوں میں معین کی جاسکتی ہے، افسوس ہے کہ ہم حالی کے متعلق اس تفصیل اور تعین پر عمل نہیں کرسکتے) چنانچہ جانسن کی چھیاسی سالہ حیات میں سے باسول صرف اکیس سالہ زندگی سے براہ راست واقف تھا اور اس عرصہ میں بھی صرف ۲۷۶ دن جانسن کی صحبت میں رہا گویا وہ بھی جانسن کی ۲/۳ دو تہائی حیات سے ناواقف تھا۔ حیات جانسن کے جملہ ۱۲۵۰ صفحوں میں سے ایک ہزار صفحات اپنے تعارف کے بعد کے یعنی جانسن کی زندگی کے ۱/۳ ایک تہائی حصہ کے لئے اور صرف ۲۵۰ صفحے ابتدائی دو تہائی زمانہ حیات کے لئے وقف ہیں۔ لیکن اس نے خود نوشتہ اور دیگر مواد کا ایسا فن کارانہ استعمال کیا ہے کہ قاری کو اس کی صناعی کا بالکل علم نہیں ہوپاتا اور انداز بیان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ اسی طرح ایک اور مشہور ترین سوانح نگار لٹن سٹراچی نے اس کے برعکس اپنی حیات وکٹوریہ کا ۲/۳ دو تہائی حصہ وکٹوریہ کے کردار کی تعمیر کے متعلق اور ایک تہائی ۱/۳ اس کے بعد کے عہد کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ طریقے فی نفسہ برے یا بھلے نہیں ہیں۔ حالات وواقعات اور معلومات اور سوانح نگار کی دلچسپی اور صناعی انکو معین کرتی ہے لیکن سوانح نگار کو اس چیز کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے موضوع کی پوری شخصیت قاری کی نظر کے سامنے آجائے۔ حالی نے بھی سرسید کی غدر کے بعد کی زندگی پر زیادہ زور دیا ہے، جس کے متعلق ان کی اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ انھیں مستند مواد بھی ملا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حالی نے بھی اسی طرح سرسید کی مکمل شخصیت کا مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کردیا ہے؟

اس سلسلہ میں نقاد مختلف الخیال ہیں مثلاً مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد حیات جاوید کو "کتاب المناقب" اور حالی کی سوانح نگاری کو مدلل مداحی اور مدحت طرازی سمجھتے ہیں ڈاکٹر عبداللہ کا خیال ہے کہ سرسید ان کی سوانح عمری میں ایک انسان سے زیادہ ایک مصلح نظر آتے ہیں۔ پروفیسر سرور کا خیال ہے کہ حالی نے حیات سے زیادہ کارناموں پر توجہ دی ہے۔ جہانتک دل الذکر دو الزامات کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ حالی کی سیرت دکردار اور علمی وعملی حیات اس الزام کی مجسم تردید ہے۔ اس پر حالی اور شبلی کے طریقۂ کار کے موازنے کے سلسلے میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی لیکن یہاں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح ایک آپ بیتی نگار کی اپنی دانست میں اپنے آپ پر کڑی سے کڑی تنقید بھی عموماً اوروں کو خود پسندی نہیں تو کم از کم فراخ دلی، رعایت

لہ حیات جاوید ص ۵۲۵ — تہ صالحہ عابد حسین سے بھی اس سلسلے میں، ان کے حالیہ قیام میسور کے دوران زمانے میں بات چیت ہوچکی ہے۔ وہ بھی مجبوری ظاہر کرتی ہیں اور اپنی معلومات کو حالی کی تحریر پر مبنی بتاتی ہیں لیکن ان کے یہ بیانات کہ حالی، سرسید کے پچیس سال دوست رہے اور اپنی بقیہ ۳۵ سالہ زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کردی، تاریخ وسنین کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

نظر اندازی اور پہلوتہی کے مترادف نظر آتی ہے اسی طرح ایک دوست کی ناقدانہ نظر اوروں کو اور خصوصاً اس کے اختلاف رکھنے والوں کو حمایت پر مبنی محسوس ہو سکتی ہے۔ یوں بھی سوانح نگاری کا یہ اصل اصول ہے کہ سوانح نگار کو اپنے موضوع کے ساتھ ایک ناقد دوست کی سی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہئے اور جہاں کہیں ممکن ہو اوروں کے اس کے بارے میں بے جا شک و شبہ کی گنجائش کے پہلو کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ چنانچہ حالی نے بھی کہیں کہیں دبی زبان سے سرسید کی وکالت کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی گڑھ کالج کے نشان میں ہلال و صلیب کے امتزاج کو سرسید کی دور اندیشی، آئین اکبری کی تصحیح و اشاعت کو قوم پر ایک احسان، ان کی غیر مکمل تعلیم کو ایک حسن اتفاق ان کی جسمانی قابلیتوں، مذہبیت اور نیک اخلاق کو عظمت کے لئے لابدی، (بہت سے لامذہب اور بداخلاق شخص بھی باعظمت گزرے ہیں) ان کی ملکی سیاست سے قوم کو علحدگی کی تاکید کو ایک خاردار جھاڑی سے پہلوتہی کی تلقین کے مماثل وغیرہ قرار دیا ہے جس سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ ٹرسٹی بل کے معاملہ کی، جس کی خود حالی، محسن الملک اور وقار الملک کے ساتھ مل کر اخبار کے لئے ایک بیان تحریر کرنے کی حد تک مخالفت کر چکے تھے، اپنی معلومات اور سمجھ کے مطابق تاویل اور صفائی کی کوشش، ان کے مخالفین کو بدنیتی کا ملزم قرار دینا غیر کے معاملہ میں سرسید کی نمک حلالی کا یہ ذکر، ان کے کارناموں میں ترتیب دکھانے کی سعی، اور دیباچہ میں نکتہ چینی کے ارادے کے ساتھ ہی اپنے اس یقین اور اوروں کو یقین دلانے کی خواہش کا اظہار کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا" اور یہ اقرار کہ ان کے بہت سے احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک بے مثل اور بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے، ایک ایسے اخلاقی طریقہ کا نمونہ پیش کرتا ہے، جس میں موضوع سوانح کی حیات مدحیہ پھولوں سے سجا دی جاتی ہے اور اس کے پودوں اور کیاریوں کی کاٹ چھانٹ اور روشوں کی درستی سے ان کی بدنمائی، نشیب و فراز اور پیچیدگی کو خوش نمائی ہمواری اور راستی سے بدلا جاتا ہے، تاکہ خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہ رکھنے والوں کی پرسکون گلگشت میں کوئی خلل نہ پڑ سکے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کی آخری دونوں کی غیر مقبولیت اور لوگوں کی غلط فہمیوں اور چہ می گوئیوں کے مدنظر اگر وہ اعتذار کا لب و لہجہ اختیار نہ کرتے اور اپنی طرف سے ان افواہوں کی اصلاح، ازالے اور تردید کی کوشش نہ کرتے تو کیا اس الوداعی گرد و غبار کو ان کی پوری زندگی پر چھا جانے اور اس کے اثر و مقصد کو دھندلا کرنے دیتے؟ حالی نے یہ محسوس کر کے کہ ابھی تنقیدی سوانح نگاری کا وقت نہیں آیا، ناسمجھ ناظرین کی رہبری کے لئے سرسید کی مجبوریوں اور دشواریوں کا بھی ذکر کر دیا اور گویا 'جناح' کے قول۔ کے مصداق موت کے بعد ساری بحث و تکرار ختم کر دی۔

لیکن حالی کی اخلاقی جرأت اور انصاف پسندی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا لب و لہجہ نرم ہوتا ہے اور ان کی طبعی شرافت، فراخدلی اعتدال اور میانہ روی ان کو کسی کے ساتھ سختی برتنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ آگرے کی نمائش میں سرسید کی سبکی، کالج میں مذہبی تعلیم کے ناکافی انتظام اور سوا مسلمان طلباء کی تعداد کے معاملے کے علی گڑھ کالج کے دوسرے کاموں سے کسی بات میں بہتر نہ ہونے، سرسید کے کالج کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کا ایک حلقہ نہ پیدا کر سکنے، سرسید کے تعلیم نسواں اور مذہب سے متعلق خیالات سے اختلاف اور اس کے باوجود ان کے اجتہاد کی اہمیت کا اقرار، ان کے اوصاف کے اوسط درجہ ہونے اور ان کو محنت اور جفاکشی سے جلا دینے، وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگ نہ جاننے، ٹرسٹی بل وغیرہ کے معاملہ میں خود رائی، ضد، ہٹ اور ڈسپاٹک طبیعت کے مظاہرے وغیرہ کا صاف اعتراف کیا ہے۔

البتہ انھوں نے سرسید کے نجی حالات و کوائف اور ذاتی پہلو کو بے نقاب کرنے سے بہت حد تک پہلوتہی کی ہے اور چونکہ خود بھی مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے اس معاملہ میں مشرقی ذہنیت اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ سرسید کے عنفوان شباب کی لغزشوں کا ذکر ایک آدھ جملے میں یہ کہکر کہ یہ رومی کے کسی زاہد کی زندگی کی رنگینی کے متعلق اس قول کی کہ ع کاش کر دے وگزاشتے۔ کے مصداق اور سرسید کے اس قول کے مطابق تھیں کہ " اپنے عیبوں کو ڈھانکے رکھو" ختم کر دیا ہے۔ علاوہ بریں سرسید کی مقابلاً زندگی، بیوی کی وفات، بچوں کی تربیت، ان کے مشغلوں، ان کی زندہ دلی کی مثالوں (جن میں سے بعض بیان نہیں کی جا سکتیں) وغیرہ کی تفصیل

سے بھی اجتناب کیا ہے۔ باوجود سرسید کی خواہش کے دشنام بھر اخط نہیں شایع کیا ہے۔ حتیٰ کہ سرسید کے بہت سے لطائف و ظرائف کو بھی اس پر کہ ان کے لئے ایک مستقل رسالہ چاہیئے، قلم انداز کر دیا ہے حالانکہ رسول کے ہیرڈس جرنل The journal of the tour Herodotus کی طرح اگر اسے الگ شایع کرتے تب بھی برا نہ تھا۔ حالی کا چھوٹی جزئیات کی اہمیت کو ظاہر کرنا یا تو پرداری کی غیر شعوری کوشش ہے یا فن سوانح نگاری کے متعلق غلط فہمی کا نتیجہ ہے مثلاً یہ کہ "بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام جزئی و کلی حیثیات پر بحث نہ کر سکے تو کم از کم اس کی نمایاں اور مسلم خصوصیتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا" یا یہ کہ "مگر ایک شخص کی زندگی ایسے مہتم بالشان واقعات سے بھری ہوتی ہے کہ انھیں سمیٹنا بیوگرافر کی طاقت سے باہر ہے چہ جائے کہ اس کے لطائف نوادر جمع کرنا" باب اول میں جزئیات کی بحث میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بڑے نہیں چھوٹے کام انسان کی شخصیت کے مظہر ہوتے ہیں اور ایک شخص کا بڑے کاموں میں طرز عمل اس کے چھوٹے کاموں میں طرز عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ لہذا یہاں لطایف و ظرائف کی اہمیت کا اعادہ بھی غیر ضروری ہے۔

حالی نے سرسید کے بچپن، تعلیم و تربیت وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی حکایات کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے۔ بنارس کی مسجد کی تعمیر (سرسید کے نام کا کتبہ) علی گڑھ کالج کے نام (مدرسۂ احمدیہ) اور کتبے، فونڈرز ڈے کی بجائے سرسید کی فونڈیشن ڈے کی تجویز وغیرہ چیدہ واقعات سے سرسید کا اپنی ناموری سے انکار، باسول کے طریقے پر سرسید کے، سچائی، محبت، دوستی راز داری وغیرہ کے متعلق خیالات کا بالواسطہ اظہار (محسن الملک اور دوسروں کے نام خطوط اور دیگر تحریروں میں) وغیرہ سے سرسید کی خصوصیات کا منتشر بیان ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں سرسید کی تصنیف و تالیف، قوت و تقریر (پبلک سپیکنگ) رفارمیشن کی کوششوں، شمائل و عادات وغیرہ کے باقاعدہ عنوانوں کی تفصیل "حیات جاوید" کے بہترین اور دلچسپ ترین حصوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسے اجزاء جزئیات و تفصیلات کی "حیات جاوید" میں کمی بلکہ یہ مجموعی طور پر خود سرسید کے اپنے متعلق اقوال کی ترجمانی نہیں کر سکی ہے مثلاً "جب رند تھے فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہد تھے تو نہایت اکھڑ تھے، جب صوفی تھے تو "رومی" سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار[1] اور میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے، اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے[2]" ظاہر ہے کہ باوجود ہر چیز میں شدت اور انتہا پسندی کے حیات جاوید میں سرسید نہ رند معلوم ہوتے ہیں نہ فرہاد نہ کبڈیوں، کنکوؤں اور کبوتروں سے ان کا کوئی تعلق معلوم ہوتا ہے نہ ناچ مجروں سے واسطہ البتہ بہت حد تک نیچری، کافر، بے دین وغیرہ کے القاب سے ملقب قوم کے غم خوار لگتے ہیں۔

سرسید کے تحریری، تقریری اور تعمیری کارناموں کی تفصیل کو حیات جاوید میں دیگر تمام مباحث سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثلاً لائل محمڈنز آف انڈیا، اسباب بغاوت ہند، تبئین الکلام (تفسیر تورات و انجیل) تفسیر القرآن، خطبات احمدیہ وغیرہ وغیرہ کے اقتباسات، خلاصے، خصوصیات، موازنے، تبصرے اور مقابلے اور ان کی اسی قبیل کی کتابوں کے مباحث کے تفصیلی تجزیے اخبارات اور مشاہیر کی رائے وغیرہ کے مطالعے کے دوران میں قاری کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب کا نام "حیات جاوید" ہے یا "تصانیف جاوید"۔ حالی کو خود بھی آخر میں اس کا احساس ہوا ہے کہ اس قسم کی مزید بحث نامناسب ہوگی۔ ۲۵ صفحے تفسیر کی نذر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دیباچے میں اشارا کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی مذکورۂ بالا خصوصیات پر مفصل بحث کرنے کا تھا۔ لیکن چونکہ بحث طولانی ہے۔ جس کی ایک بائیوگرافی متحمل نہیں ہو سکتی، اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی، اس لئے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آیندہ لکھیں گے اس کو کسی بادقت میگزین کے متعدد نمبروں میں وقتاً فوقتاً شایع کیا جائے گا۔" حالی کے حیات جاوید میں شامل کردہ بہت سے مباحث پر یہ چیز صادق آتی ہے۔ حقیقت

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۸۰۳ [2] حیات جاوید - [3] ایضاً

ہے کہ حالی نے تفسیر کے بعض مباحث کا خلاصہ جو لکھا ہے اس کے ایک پیراگراف کی بجائے ایک ایک جملہ کافی تھا۔ لیکن وحید الدین سلیم[1] اس طویل بحث کو بھی ادھوری سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں سرسید کی مذہبی روشن خیالی پر نکتہ چینی کے موقع سے فایدہ نہیں اٹھایا گیا یہ رہی تصانیف (تقریروں کا خلاصہ بھی ہے) کی تفصیل جس کے متعلق بھی اگر یہ کہا جائے کہ بحیثیت ادیب چونکہ یہ حالی کا خاص میدان ہے اس لئے ان کا جی للچایا ہوگا، تو غلط ہوگا، کیونکہ، حالی اصول پرست انسان ہیں اور وہ اپنے آپ کو اور اپنے رجحانات کو اجتماعی مقاصد کے تحت رکھتے ہیں اور ہر چیز پر افادی نظر ڈالتے ہیں لیکن اسی قسم کی تفصیل ہمیں سرسید کی تعلیمی کوششوں (پانچواں باب) علی گڑھ کالج اور بورڈنگ کے خصوصیات ریاضت، وقت کی پابندی وغیرہ کے حکمران قوم کی اطاعت کے لئے ضروری ہونے کا مضحکہ خیز ذکر، مسلم کانفرنسوں، کونسل کی خدمات (مثلاً ایجوکیشن کمیشن کے سامنے شہادت) وغیرہ کی روداد میں بھی ملتی ہے۔ کارناموں کے بیان میں بال کی کھال نکالنے والی یہ تفصیل اور ذاتی حالات میں وہ ایجاز و اختصار اور سرسری سے اشارے، قاری کے احساس تناسب پر گراں گزرتے ہیں اور وہ ہیرو کی ذاتی اور شخصی طور پر بہتر واقفیت کی تمنا دل ہی دل میں لئے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح حالی کا غیر ضروری حجاب بھی قاری کے بار خاطر ہوتا ہے اور وہ مصنف کے عمومی اعتدال اور میانہ روی کے مدنظر اپنے موضوع کی پردہ داری کے معاملہ میں اس انتہا پسندی اور غیر پسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور خامی جو حالی کے یہاں ہمیں نظر آتی ہے اور جس نے کتاب کے حجم کے اضافے میں مدد دی ہے وہ انکی خطوط کے اندراج کی عادت ہے۔ سوانح نگاری میں عموماً خطوط کی نقل کی نہیں بلکہ خطوط کے استعمال کی ضرورت ہے۔ حالی نے سرسید کے نجی اور عام حالات و کردار اور کارناموں دونوں کے معاملے میں، نہایت فراخ دلی سے خطوط کو نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اخبارات کی تحریروں، مشاہیر کی تقریروں اور مختلف تصانیف سے طویل اقتباسات وغیرہ کو بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اس میں حتی الامکان کانٹ چھانٹ، امتیاز اور احتراز کی ضرورت تھی اسی قسم کی کمی، سرسید کے متعلق غلط فہمی اور کتاب کی اشاعت میں تاخیر ناشروں، کتب فروشوں اور پڑھنے والوں کی بے اعتنائی کا باعث ہوئی ورنہ حیات جاوید اور الفاروق ادبی اور قومی دونوں لحاظ سے ناقابل فراموش کتابیں تھیں۔

جہاں تک حالی کے اسلوب کا تعلق ہے، اس میں حیات جاوید میں وہ شادابی اور شگفتگی نہ سہی جو یادگار غالب میں ہے اور اس میں سرسید کی شخصیت کے اصلاحی اور موعظتی رنگ کی جھلک سہی، جس سے گریز مشکل ہے اور کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی بیجا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عربی سے متاثر اور صاف و سادہ روسی نثر سے مشابہ، حالی کی نثر کی پختگی، پاکیزگی، سلاست روانی سادگی، سنجیدگی متانت، وضاحت وغیرہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ فنی، اصطلاحی، فلسفیانہ یا جذباتی کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ بھی ان کی تحریر میں ان خصوصیات میں سد راہ نہیں بن سکتا۔ جس جدید نثر کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی، حالی نے اسے مستحکم کر دیا۔ آج کی اور مستقبل کی زبان حالی ہی کا عطیہ ہے، نئے لکھنے والوں اور ترقی پسندوں نے اسی کو اپنایا ہے (آج جدید نثر نگاروں میں آزاد، نظیر احمد اور شبلی کا مقلد شاذ و نادر ہی کوئی نظر آتا ہے) افسوس ہے کہ کتاب کی ضخامت اور زمانے کی عجلت پسندی نے زبان، ادب اور تمدن کے اس خزانے سے لوگوں کو محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ حالی کی اپنی مختصر آپ بیتی بھی ملتی ہے جو اگرچہ بظاہر ایک چھوٹی چیز ہے لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے کلام اہم ہے اور ایک ڈھانچہ ہے جسے بعد میں اسماعیل میرٹھی اور صالحہ عابد حسین جیسے لوگوں نے گوشت پوست سے آراستہ کیا۔ مولانا حالی۔ کا آب حیات کے لئے لکھے ہوئے مومن خاں مومن کے حالات کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

(باقی)

---

[1] معارف جون ص ۱۰۰

ایک عجیب و غریب تاریخی جُرم

(۱)

اڈمونڈ کی عمر ۲۴ سال کی تھی جب اس نے ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کی - چونکہ یہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے انھیں اس کی کامیابی پر بڑی مسرت ہوئی اور اس کے باپ نے جو وکیل میں ڈاکٹر کتا اپنے بیٹے کے لئے پیرس کے قیام کو مناسب سمجھا۔

چونکہ اڈمونڈ حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت کے لحاظ سے بھی اپنے اندر خاص کشش رکھتا تھا، اس لئے وہ یہاں بہت جلد مشہور ہوگیا اور پیرس کے اعلیٰ اعلیٰ خاندانوں میں اس کی رسائی ہوگئی۔

اس کو پیرس میں اپنا کام شروع کئے ہوئے ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ اس کا ایک دوست جو زمانۂ طالب علمی کا رفیق تھا، ایک دن اڈمونڈ کے پاس آیا اور بولا کہ " میں آج کی رات ایک نہایت اہم ضرورت سے پیرس چھوڑ رہا ہوں - میں بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ میری غیبت میں میرے ایک مریض کا علاج جاری رکھیں، چونکہ وہ بہت غریب ہے اس لئے مجھ معلوم ہے کہ میرے بعد مشکل سے وہ کوئی طبی مشورہ حاصل کرسکتا ہے - اس کا نام بوئیں بادر ہے - اور اپنی بیوی کی اعانت سے تصویریں بنا کر بہ مشکل بقدر کفاف حاصل کرسکتا ہے"۔

اڈمونڈ نے پورے جوش مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کرلیا۔ اور اسی وقت وہ بادر مصور کے مکان پر پہونچا، لیکن بدقسمتی سے وہ حالت نزع میں تھا اور قبل اس کے کہ اڈمونڈ اس کے لئے کوئی دوا تجویز کرتا اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی کو قدرتاً بیتاب و ملول ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ دنیا میں اپنے تئیں چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دی گئی تھی، لیکن اس کے اضطرار کا یہ بھی ایک خاص سبب تھا کہ وہ غریب مرنے والے کی تجہیز و تکفین بھی نہیں کرسکتی تھی۔

اڈمونڈ نے یہ حالات معلوم کرکے اس کو تسکین دی اور اپنے پاس سے تمام ضروری مصارف ادا کرکے آیندہ بھی اعانت کا وعدہ کیا چونکہ اس قسم کی ہمدردی دوستی و محبت کے تمام مدارج دفعتہً طے کرا دیتی ہے، اس لئے ان دونوں میں فوراً خلوص پیدا ہوگیا اور رفتہ رفتہ اڈمونڈ کو اس سے محبت ہوگئی، کیونکہ سراوین (بادر مصور کی بیوی) حقیقتاً صورت کے لحاظ سے صد درجہ دلکش ہستی تھی اور ایک انسان کے لئے مشکل تھا کہ اس کے دائرۂ جذب و کشش سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

اڈمونڈ کی اس حیات معاشقہ کو تین سال کا زمانہ گزر گیا اور اس مدت میں مخفی محبت کی جتنی لذتیں حاصل کیجا سکتی ہیں، ان دونوں نے حاصل کیں۔ آخر کار ایک دن آیا کہ سراوین کے نگاہ سے پردہ اٹھا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اڈمونڈ اس سے بیزار ہوگیا اور اس کی اعانت و محبت سے وہ بالکل محروم ہوگئی ہے۔

اس نشہ کے زایل ہونے کے بعد اڈمونڈ نے پھر اپنے پیشہ کی طرف توجہ کی اور پورے انہماک کے ساتھ کسب جاہ و شہرت میں مصروف ہوگیا چونکہ اڈمونڈ میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بام شہرت پر پہونچا دیتی ہیں، اس لئے وہ اپنے مقصد میں بہت جلد کامیاب ہوگیا اور اس کے والدین کو اس کی شادی کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔

ایک دن یہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک نہایت ہی شگفتہ حُسن رکھنے والی نوجوان لڑکی کو گاڑی میں سامنے سے جاتے ہوئے دیکھا اس نے بھی اپنا سمت سفر بدل کر اسی کے پیچھے پیچھے جانا شروع کیا، حتی کہ وہ ایک جگہ اتر کر مکان میں داخل ہوگئی۔ اب اس کے لئے یہ معلوم

کرتا چنداں دشوار نہ تھا کہ یہ کس خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے کیا حالات ہیں، اس لئے اس نے یہ تمام باتیں معلوم کرکے اپنی ماں کو اطلاع دی اور آخر کار اڈمونڈ کی آمد و رفت وہاں شروع ہوگئی۔ چونکہ یہ سارے پیرس میں خاص شہرت رکھتا تھا اور علاوہ اس کی ظاہری کے اس کے دولتمند ہونے کا خیال بھی کوئی ادنےٰ سفارش نہ تھا، اس لئے وہ لڑکی اس کی طرف بہت جلد مایل ہوگئی اور اس نے شادی کا مسئلہ پیش کردیا، چونکہ پیرس میں لڑکی کے والدین اول اول اظہار رضامندی سے انکار کردیتے ہیں تاکہ اس طرح ان دونوں میں اور زیادہ محبت بڑھ جائے اس لئے لڑکی کی ماں نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن جب لڑکی اس صدمہ سے سخت بیمار ہوگئی اور چارۂ کار دوسرا نظر نہ آیا تو اس کی شادی اڈمونڈ سے کردی گئی۔

بظاہر اڈمونڈ کو ہر شخص دولتمند انسان سمجھتا تھا اور اس کی شہرت اور پیشہ کی کامیابی کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی مالی حالت بہت خراب تھی اور قمار بازی کی عادت نے جو بلاد مغرب کی تمام بلند سوسائٹیوں میں بکثرت رائج ہے اُسے سخت تباہ کر رکھا تھا لیکن بظاہر وہ اپنی کمزوری کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتا تھا اور ہر شخص سے اُسے کامیاب و بامراد خیال کرتا تھا۔

شادی کے دوسرے سال اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ اور اسی زمانہ میں جب کہ تہنیت پیش کرنے والے احباب آتے جاتے رہتے تھے اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "تم اپنی لڑکی کی زندگی کا بیمہ کیوں نہیں کراتے، سالانہ تھوڑی سی رقم ادا کرنی پڑی گی اور بارہ سال کے بعد یکمشت تم کو معقول رقم مل جائے گی جس کو تم اس کی تعلیم پر صرف کرسکتے ہو۔

اڈمونڈ نے اس رائے کو پسند کرکے اسی وقت بیمہ کمپنی کے ایک کارکن کو بلاکر تمام مراحل طے کرلئے تھے اور پھر بدستور اپنی بظاہر خوش حال اور بہ باطن تباہ زندگی کے مصائب میں گرفتار ہوگیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے آلام و مصائب کس حد تک پہونچ جاتے اگر اسی اثناء میں اس کی ساس جو اپنی بیٹی سے ملنے آئی تھی دفعتہً بیمار ہوکر نہ مرجاتی۔ چونکہ یہ مالدار عورت تھی اس لئے اس کا تمام ترکہ اس کی بیٹی کو ملا اور اس طرح کچھ دنوں کے لئے اڈمونڈ کی فکروں میں بہت کچھ کمی پیدا ہوگئی۔

پیرس کے اس حصہ میں جو صرف غرباء کے رہنے کے لئے مخصوص ہے، ایک حقیر و بوسیدہ مکان میں سراوین اپنی پریشان زندگی بسر کر رہی ہے۔ اب اس کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہوچکا ہے اور تصویر کشی کے ذریعہ سے صرف اس قدر حاصل کرسکتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حیات باقی رہے، اس لئے وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کرسکتی۔

اسی حال میں کئی سال بسر ہوگئے اور اڈمونڈ۔ اُس اڈمونڈ کے حال سے، جس کی محبت میں اس نے اپنی پوری [illegible] کے تین سال حد درجہ لطف و مسرت کے ساتھ بسر کئے تھے، وہ بالکل بے خبر رہی، اس میں شک نہیں کہ سراوین کو اب بھی اس سے محبت تھی اور وہ اب بھی اس کی بے اعتنائیاں اور بے پروائیاں عفو کردینے کے لئے طیار تھی۔ لیکن اڈمونڈ نے جو ایک بار اس کی طرف سے منہ موڑا تو پھر یہ خبر نہ کی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

ایک دن جب کہ وہ سخت حالت یاس میں بجھی ہوئی آگ کے پاس بیٹھی ہوئی اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی دفعتہً کسی شخص نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ سراوین اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اڈمونڈ کو اپنے سامنے دیکھا۔ بجلی کی طرح تمام گزشتہ واقعات اس کے دماغ سے گزر گئے اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی اسی شدت کے ساتھ اڈمونڈ سے محبت کرتی ہے، انڈمونڈ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور بولا کہ:-

"اے سراوین اب گزشتہ دور محبت کی یاد مجھے نہ دلاؤ کیونکہ میری شادی ہوچکی ہے۔ البتہ میں اس پر بہت نادم ہوں کہ اتنے عرصہ تک میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکا۔ بہرحال اب میں اس غفلت کی تلافی کے لئے آمادہ ہوں"

سراوین نے جواب دیا کہ "مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہی ہوں، لیکن مجھے اپنے بچوں کی تعلیم

کی بڑی فکر ہے جس کا انتظام مجھ سے نہیں ہو سکتا، علاوہ اس کے بڑی لڑکی طویل علالت نے بھی مجھے سخت بیچین کر رکھا ہے"۔

اڈمونڈ — "کہاں ہے۔ بلاؤ"۔

سراوین اٹھی اور اپنے ایک پڑوسی کے مکان سے اُسے بلا لائی۔ اڈمونڈ نے نہایت غور سے اُسے دیکھکر کہا کہ "اس کی حالت اچھی ہے اور صرف غذا میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہے، سو تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں سارا انتظام کر دوں گا اور ہاں تمھاری بہن میڈم ریمیٹر کا کیا حال ہے، کیا تم سے ملاقات نہیں ہوتی؟"

سراوین — "نہیں، کبھی کبھی آتی ہے، لیکن چونکہ اس کا حال مجھ سے زیادہ خراب ہے اس لئے وہ میری مدد کیا کر سکتی ہے"۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں طرف سکوت طاری رہا اور پھر اڈمونڈ نے اپنی کرسی قریب کر کے کہا "اے سراوین، ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، جس سے نہ صرف تمھارا بلکہ تمھاری اولاد کا مستقبل بھی امید افزا ہو جائے گا، لیکن قبل اس کے کہ میں وہ تدبیر بیان کروں، مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرو گی ورنہ میرے تمھارے دونوں کے لئے مشکلات پیش آجائیں گی"۔

سراوین — "کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمھارے کسی راز کو ظاہر کر دیا ہو"۔

اڈمونڈ — "اس کا مجھے یقین ہے، لیکن احتیاطاً میں پھر کہتا ہوں کہ یہ تدبیر کسی انسان پر ظاہر نہ ہونی چاہیئے"۔

یہ کہکر وہ اٹھا اور باہر دروازہ سے نکل کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد اندر سے بند کر لیا اور سراوین کے قریب آکر بولا کہ "سب سے پہلے تو ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ تمھاری زندگی کا بیمہ کرا دیا جائے، چونکہ تمھاری عمر چالیس سے زائد نہیں ہے اور صحت بھی اچھی ہے اس لئے کمپنی بڑی رقم کا بیمہ کرنے پر طیار ہو جائے گی"۔

سراوین حیرت زدہ ہو کر بولی کہ "میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے، سالانہ قسط کیونکر ادا کر سکوں گی۔ اور اگر یہ میرے امکان میں ہوتا تو میں پانچہزار فرانک کا بیمہ کرانے کے لئے طیار ہو جاتی"۔

اڈمونڈ — "پانچہزار! میں تو پانچ لاکھ فرانک کا بیمہ کرانا چاہتا ہوں۔ چونکہ میری حالت فی الحال اچھی ہے اس لئے دو چار قسطیں ادا کر دوں گا اور اس کے بعد ادا کرنے کی نوبت نہ آئے گی"۔

سراوین یہ سن کر ایک حیرتناک تبسم کے ساتھ مسکرائی۔ اڈمونڈ نے کہا "میرا اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ تم جلد مر جاؤ گی اور اس لئے قسطوں کے ادا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ کیونکہ تم ماشاءاللہ ابھی صحیح و توانا ہو اور مجھے یقین ہے تم اپنی عمر طبعی کو پہونچو گی"۔

یہ سن کر سراوین اور زیادہ متحیر ہوئی کہ پھر قسطوں کے روانہ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور اس لئے وہ اب سراپا استفہام تھی۔ اڈمونڈ نے کہا کہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ ایک یا دو قسطوں کے بعد تم اپنے تئیں کسی سخت مرض میں مبتلا ہونا ظاہر کرو گی اور حسب قاعدہ تمھیں بیمہ کمپنی کو اس کی اطلاع کرنی ضروری ہو گی۔ جب کمپنی دیکھے گی کہ تمھاری جان خطرہ میں ہے تو وہ فوراً مفاہمت کی کوشش کرے گی اور تمھاری زندگی بھر چار پانچ ہزار فرانک سالانہ پر یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔ یہ میرا ذمہ ہے کہ بظاہر تم سخت مرض میں مبتلا نظر آتی رہو اور فی الحال تمھیں کوئی آزار نہ ہو"۔

اس میں شک نہیں کہ اگر سراوین طبعاً شریف النفس ہوتی تو اس مکر و فریب کو کبھی گوارا نہ کرتی لیکن حقیقت یہ ہے افلاس اچھے سے اچھے اخلاق کے انسان میں ردی خصایل پیدا کر دیتا ہے اور آخر کار سراوین نے بھی اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔

(۳)

چند دن میں بیمہ کی کارروائی مکمل ہو گئی اور ڈاکٹر اڈمونڈ نے اپنی ضمانت پیش کر دی کہ ۸۰۰ گنی کی سالانہ قسط ادا ہوتی رہے گی اس کے بعد اڈمونڈ نے وہ تدابیر شروع کیں جن سے صرف وہی واقف تھا چنانچہ وہ ایک مشہور وکیل کے پاس گیا اور بیان کیا کہ ا۔ جس زمانہ میں سراوین سے میرے تعلقات تھے، اس وقت میں وقتاً فوقتاً اس کو قرض دیتا رہتا تھا، یہاں تک کہ قرض کی مقدار بہت

بڑھ گئی اور اب اس کے ادا ہونے کی صورت یہی تھی کہ اس کی زندگی کا بیمہ کرا کے اس رقم کو قابل وصول بنائے۔ چنانچہ سراوین اس پر راضی ہوگئی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، ورنہ میری بیوی کو سخت ناگوار ہوگا، وکیل نے پوچھا کہ "قرض کی مقدار کتنی ہے" اڈمونڈ نے بجائے ۵ لاکھ فرانک کے صرف ایک لاکھ فرانک بتایا۔ ہر چند وکیل کو اس پر بھی سخت حیرت ہوئی، لیکن اس نے دستاویز کا مسودہ مرتب کر دیا اور ڈاکٹر نے اپنے گھر جا کر اسے صاف کر کے وہی ۵ لاکھ فرانک کی رقم درج کی اور سراوین سے اس پر دستخط لے لئے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک وصیت نامہ بھی اس سے لکھوا لیا کہ "میرے بعد میرے تمام مطالبات جو بیمہ کمپنی پر عاید ہوں گے ان کا مالک ڈاکٹر اڈمونڈ ہوگا اور وہی میری اولاد کا ولی ہوگا"۔

(۴)

چار مہینے گزر گئے اور سراوین لطف و مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی، کیونکہ اڈمونڈ اس کے مصارف کے لئے بھی ہر ماہ معقول رقم دیا کرتا تھا۔ ایک دن اڈمونڈ آیا اور بولا کہ "آج میری بیوی ریف چلی گئی اس لئے مجھے فرصت مل گئی کہ تم سے قرارداد کے متعلق مریض پنے کی درخواست کروں"

سراوین ۔ "لیکن میں حیرت میں ہوں کہ کس بیماری کا بہانہ کروں، جب کہ میں آج معمول سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں"۔

اڈمونڈ ۔ "میری رائے میں تمھیں ظاہر کرنا چاہئے کہ تم زینہ سے گر پڑی ہو اور تمھیں کوئی سخت عصبی صدمہ پہونچا ہے"۔

آخر کار رات کو تمام پڑوسیوں نے زینہ پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی اور صبح کو سب نے جان لیا کہ سراوین پھسل گئی اور اس کے سخت چوٹ آئی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر بلایا گیا اور اس نے علاج شروع کیا۔ جب سراوین کی بہن کو خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی عیادت کے لئے آئی اور اس سے سراوین نے سارا حال بیان کر کے عہد لے لیا کہ کسی پر ظاہر نہ کرے گی۔

(۵)

جب ایک مہینہ گزر گیا سراوین کی بیماری کو ہو گیا تو اڈمونڈ آیا اور بولا کہ "اب وقت آیا ہے کہ بیمہ کمپنی کو اطلاع دی جائے لیکن خرابی یہ ہے کہ جب کمپنی اپنا ڈاکٹر معائنہ کے لئے بھیجے گی اور تمھیں صحیح و توانا پائے گی تو نتیجہ نہ نکلے گا، اس لئے میں تمھیں ایسی دوا دیتا ہوں جس سے تم عارضی طور پر بیمار پڑ جاؤ گی ۲۴ گھنٹہ کے بعد پھر اچھی ہو جاؤ گی لیکن یہ ضرور ہے کہ تمھیں اس طرح تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی"۔

سراوین اس پر راضی ہو گئی اور دوا پینے کے بعد بیمہ کمپنی کو اپنی علالت کی اطلاع دی دوا نے اپنا اثر کرنا شروع کیا اور وہ انتظار کرنے لگی کہ کمپنی کا کوئی ڈاکٹر آتا ہوگا۔ لیکن وہ اس سے واقف نہ تھی کہ کمپنی کبھی اپنا ڈاکٹر نہیں بھیجتی کہ مبادا وہ شخص جس کی زندگی کا بیمہ کیا گیا ہے بڑا مانے اور غصہ میں قصداً اپنی جان دیدے۔ اس لئے وہ انتظار ہی کرتی رہی اور اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اسی درمیان میں اڈمونڈ کی ایک تحریر پہونچی کہ "میں آ رہا ہوں اور شام تمھارے ہی پاس بسر کروں گا"۔ اس تحریر کو پڑھ کر سراوین بہت مسرور ہوئی اور اپنی تکلیفوں کو زیادہ صبر و ضبط سے برداشت کرنے لگی۔

آخر کار شام کو ۶ بجے اڈمونڈ آیا اور رات کے دس بجے تک وہیں رہا لیکن سراوین کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی صبح کو پڑوسیوں نے اسی ڈاکٹر کو پھر بلایا جس کا علاج پہلے شروع کیا گیا تھا، لیکن جب وہ آیا تو اس سے کسی نے کہدیا کہ "مریضہ نے تمھاری دوا نہیں کی" اس لئے وہ برہم ہو کر چلا گیا۔

شام کو پھر اڈمونڈ گھبرایا ہوا آیا۔ اور دوا کی دوسری خوراک دیکر بولا کہ "میں ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ مجھے ایک خاص ضرورت سے ریف جانا ہے" اس خوراک کے بعد سراوین کی حالت بہت ردی ہو گئی اور مجبوراً ایک اور ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا اس نے ہیضہ تجویز کیا اور دوا پینے کے لئے دی۔

سراوین مسکرائی اور اپنی بڑی لڑکی سے بولی کہ "اس ڈاکٹر کی دوا مجھے اچھا نہیں کر سکتی" تم ناحق فکر کرتی ہو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

جب دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر دوبارہ آیا تو سراوین حالت نزع میں تھی اور اسی کے سامنے اس نے جان دیدی۔

شام کو اڈمونڈ نے کمپنی کو اطلاع دی کہ "سراوین کا انتقال ہو گیا ہے اور وصیت کے ذریعہ سے اپنے تمام مطالبات کا مالک

کمپنی بنا گئی ہے۔" کمپنی نے اڈمونڈ کے دعوے اور سراوین کے وصیت نامہ کو صحیح تسلیم کر لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ روپیہ ادا کرتی پولیس کے پاس ایک گمنام تحریر اس مضمون کی پہونچی کہ "سراوین کی موت ایک راز ہے اور پولیس کو اس کی تفتیش کرنی چاہیئے۔"

جب چودہ دن گزر گئے اور بیس ہزار گنی کی رقم جو اڈمونڈ کو ملنی چاہئے تھی نہیں ملی تو یہ سخت برہم ہوا اور کمپنی سے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ لیکن دوسرے دن صبح کو جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا دروازہ کی گھنٹی بجی اور خادمہ ایک کارڈ لیکر آئی۔ اڈمونڈ نے اس کارڈ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی خفیہ پولیس کا افسر ہے چنانچہ اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے کہ "میں ابھی ۵ منٹ میں واپس آتا ہوں۔" باہر گیا اور بغیر کسی خوف و ہراس کے اظہار کے اس سے گفتگو شروع کی۔

خفیہ پولیس کے افسر نے کہا کہ "ہمارے محکمہ کو اطلاع ملی ہے کہ سراوین کی موت ایک راز ہے اس لئے اس کی لاش قبر سے برآمد کیگئی اور معائنہ سے معلوم ہوا کہ ایک نباتی زہر کے ذریعہ سے جسے ڈجی ٹیلس کہتے ہیں اس کی موت وقوع میں آئی ہے چنانچہ اس کے کاغذات وغیرہ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا بیمہ بڑی رقم پر کرایا تھا۔ کمپنی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ساری رقم آپ کو ادا کی جاتی ہے اس لئے میں آپ سے دریافت کرنے آیا ہوں کہ سراوین ایسی مفلس عورت کیونکر اتنی بڑی رقم پر اپنی زندگی کا بیمہ کر سکی، جب کہ وہ کسی طرح ایک قسط بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔"

اڈمونڈ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ تمام باتوں کا جواب دیا اور سراوین کی تحریریں نکال کر اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اسکی مقروض تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میرا قرض تو اس کے اوپر صرف بیس ہزار فرانک ہے، جو مجھ کو ملے گا باقی اس کی وصیت کے مطابق اس کی اولاد کی تعلیم پر صرف ہوگا ـــــ پولیس افسر رخصت ہو گیا لیکن جب وہ پھر اپنی بیوی کے پاس گیا اور وہاں کھڑکیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ خفیہ پولیس اس کے مکان کی نگرانی کر رہی ہے، اور وہ حراست میں ہے، اب چونکہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی اور اُسے آنے میں دیر بھی زیادہ ہو گئی تھی اس لئے اُس کو مجبوراً اپنی بیوی سے سارا حال ظاہر کرنا پڑا، مگر اس نے وہ خاص باتیں جو اُسے مجرم بنانے والی تھیں نہ اپنی بیوی پر ظاہر کیں اور نہ پولیس افسر کو ان سے آگاہ کیا۔

(۶)

دوسرے دن اڈمونڈ باضابطہ حراست میں لے لیا گیا اور سارے پیرس میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، اڈمونڈ کا خسر چونکہ پیرس کا نہایت مشہور وکیل تھا اور اڈمونڈ خود بھی اپنے ظاہری اخلاق کی بدولت شہر کی کافی ہمدردی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس لئے جب مقدمہ عدالت گاہ میں پیش ہوا تو ہر شخص اڈمونڈ کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے آمادہ تھا اور پیرس کے بہترین وکلاء اس کے ساتھ تھے۔ سرکاری وکیل نے جو ثبوت پیش کیا اس میں سب سے اہم سراوین کی بہن کا بیان تھا جس کو سارا حال معلوم تھا اور اس کے بعد ڈاکٹر کی شہادت تھی جس کو سراوین کی لاش میں ڈجی ٹیلس کے ذرات دستیاب ہوئے تھے۔

جس وقت سرکاری وکیل نے اڈمونڈ کے خلاف اپنی گفتگو شروع کی تو اس نے دورانِ بحث میں یہ بھی ظاہر کیا کہ اڈمونڈ کی ساس بھی غائباً اس جذبہ کا شکار ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ اس کو ثابت نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس پر زیادہ گفتگو نہیں کی اور صرف سراوین کے واقعات قتل پر پوری روشنی ڈال کر اڈمونڈ کو قاتل ثابت کیا۔

اڈمونڈ کے خسر نے صفائی میں اڈمونڈ کی گزشتہ زندگی اور اس کی پاکیزہ اخلاق کی متعدد مثالیں پیش کر کے اپنی قوتِ بیان سے جج کے خیال کو بالکل اپنے موافق کر لیا۔ لیکن فیصلہ کے وقت جوری سے رائے لی گئی تو انھوں نے اُسے سراوین کے قتل کا مرتکب قرار دیا اور سزائے موت اس کے لئے تجویز کی گئی۔ لیکن اڈمونڈ کی عجیب و غریب فطرت اپنی تکمیل کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوئی جب فصاص کے وقت اُسنے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ:

آپ لوگ شاہد رہیں اور میرے تمام اعزا اور احباب کو یہ خبر پہونچا دیں کہ میں بالکل بے قصور ہوں اور عدالت کی غلطی پر میری قربانی چڑھائی جاتی ہے۔

تمدنِ جدید کی دردناک داستان

تہذیب و شائستگی کے صحیح خط و خال

اب سے ۳۲ سال قبل میں نے مغرب کے تمدنِ جدید پر اک سرسری تبصرہ کیا تھا، جس کو آج غلط ہو جانا چاہئے تھا لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ آج بھی حرف بہ حرف صحیح ہے ۔ یہ میری فراست نفس نہیں بلکہ مہذب انسان کی "دہانتِ نفس" ہے وہ مہذب انسان جس نے یوروپ میں جنم لیا اور آہستہ آہستہ ساری دُنیا پر پھیل گیا ۔ نیاز

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بیسویں صدی میں بہت ترقی کر رہا ہے ۔ پچھلے اکتشافات نے انسان کی آنکھیں کھول دی ہیں ۔ علمی تصنیفات نے ایک نئی دُنیا پیدا کر دی ہے ۔ فلکی مشاہدات نے پردۂ غیب چاک کر دیا ہے ۔ کیمیاوی ایجادوں نے اتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں کہ جن باتوں پر کل بادشاہ بھی قادر نہ تھے آج معمولی درجہ کے لوگوں کے اقتدار سے باہر نہیں ۔ ہم سمندر میں سفر کریں تو بادِ مخالف کی پروا نہیں ۔ ہوائی سیر کریں تو باد و باراں کے طوفان مزاحم نہیں ۔ گھر بیٹھے سارے جہان کی خبریں پڑھتے ہیں ۔ تار اور ٹیلی فون سے ملک ملک کے حالات اپنے کانوں سنتے اور آنکھوں دیکھتے ہیں ۔ بجلی کی قوت ہمارے لئے روشنی کرتی، کھانا پکاتی، پانی ٹھنڈا کرتی ہے، جوتا صاف کرتی، گھر میں جھاڑو دیتی، کپڑے پہناتی، پنکھا جھلتی ہے ۔ یہ باتیں پہلے کہاں حاصل تھیں، ان باتوں سے قطع نظر یہ دیکھو کہ جو آرام، جو مسرت، جو لطف ہمیں آج حاصل ہے اُس کا عشر عشیر بھی کبھی دُنیا کو حاصل ہوا؟ بیمار ہوں تو دنیا کے اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کا مشورہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ ایسی دوائیں طیار ہو گئی ہیں جن سے منٹوں میں فایدہ ہوتا ہے، عدد و بدلوا لینے سے عمر بڑھ جاتی اور جوانی لوٹ آتی ۔ ہڈی ٹوٹ جائے تو جانوروں کی ہڈی کا جوڑ لگ جاتا ہے، آنکھیں خراب ہو جائیں تو مصنوعی آنکھیں کام دینے لگتی ہیں ۔ موسمی تغیرات ہمارے ہاتھ میں آ رہے ہیں، بارش کا ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار میں آتا جاتا ہے، فضا کے کہربائی ذرات ہمارے کام کرنے کے لئے طیار ہیں، آفتاب کی حرارت ہماری غلام بنتی جا رہی ہے، کیڑے مکوڑوں کے مہلک جراثیم ہماری فوج کا کام دینے کے لئے ترتیب دئے جا رہے ہیں، قحط کا نشان مٹایا جا رہا ہے، ادی فارغ البالی کے نئے نئے طریقے نکالے جا رہے ہیں، حفاظت و دفاع ذات اور عزتِ نفس کے بہترین سامان پیدا ہو رہے ہیں، اب جنگوں میں ہمارا ایک متنفس بھی ضایع نہیں ہوگا، گھر بیٹھے لڑائیاں ہوا کریں گی اور جس کے پاس علم و دماغ کی قوت زیادہ ہوگی وہی جیتے گا ۔ کیا یہ باتیں دُنیا کو پہلے حاصل تھیں ؟

نوعِ انسان پہلے غلام تھی کوئی شخص آزاد و خود مختار نہ تھا، کسی پر انسانوں کی حکومت تھی، کوئی اپنے واہمہ کا غلام تھا اور کسی پر اس کے مجنونانہ توہمات حکمراں تھے، لیکن اب علم کی روشنی، فلسفہ کی بصیرت اور اقلیت کے احیار نے ان تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اب نہ کسی پر کوئی ظلم کر سکتا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اپنی محنت سے مستفید ہونے پر مجرم قرار پا سکتا ہے، دُنیا میں آزادی خیال پھیل رہی ہے، نظریں وسیع ہو رہی ہیں، لوگ معاملہ فہم ہوتے جا رہے ہیں اور وسیع الخیالی، ان تمام بندشوں کو توڑ رہی ہے، اب ہر طرف آزادی و فارغ البالی ہے، جمہوری اور دستوری حکومتیں اپنی فیوض و برکات سے دُنیا کو

فایدہ پہونچا رہی ہیں، جو قومیں حکومت کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں وہ حکومت کے لئے طیار ہو رہی ہیں اور ہر شخص ایک ایسی زندگی بسر کرنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے جو قدیم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور جو شاید مستقبل میں بھی حاصل نہ ہو۔

انسانی ترقی میں سب سے پہلی چیز اجتماعی نظام کی تکمیل اور اس کے اصول و قواعد کا سعادت پر مبنی ہوتا ہے لیکن دُنیا نے اس میں ایک انچ ترقی نہیں کی ہے اجتماعی نظام جن بنیادوں پر قایم کیا گیا ہے وہ اتنے پودے اور کھوکھلے ہیں کہ رات دن ان میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور اپنے سامنے ساری دنیا کو مضطرب و بے چین رکھتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں اجتماع انسانی اخلاقی بنیادوں پر قایم تھا جو سیاسی بنیادوں سے زیادہ مضبوط تھیں، اس لئے ان میں اتنے تغیرات نہیں ہوتے تھے لیکن ترقی یافتہ زمانہ نے اب اخلاق کی جگہ سیاست پر اب اس کی بنیاد قایم کی ہے جو بہت زیادہ ضعیف و کمزور ہے۔

یوں تو موجودہ زمانہ کا پورا انتظام تمدن اتنا ناقص ہے کہ اس سے ہرگز توقع نہیں ہوسکتی کہ دنیا اس پر عمل پیرا ہو کر ترقی کر سکے، کیوں کہ وہ ہمیں ظلم و ستم، خود غرضی، بد دیانتی، طمع و حرص، اسراف، نمایش اور کذب و فریب کی طرف لے جا رہا ہے اور کوئی شخص دوسرے کے قول و فعل پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا اور جب باہم اعتماد نہ ہو تو ترقی کا ہونا معلوم۔ یورپ جو عہدِ حاضر کی ترقی کا نمایاں ترین جولانگاہ ہے، اپنی اس نمایش اور چھوٹی زندگی سے گھبرا گیا ہے، اجتماعی زندگی کے راز دار کوشش کر رہے ہیں کہ ایک نیا نظام تمدن بتائیں، سوسائٹیاں اپنی پچھلی حالت پر افسوس کر رہی ہیں اور ہر زبان یہی کہتی ہے کہ جلد سے جلد اس کو توڑ دینا چاہئے۔ تم ایک یورپین کو اس کے گھر میں دیکھو، جہاں وہ اپنے بیوی بچوں سے ملتا ہے۔ پھر کاروباری زندگی میں اس کا مطالعہ کرو اور پھر اس وقت کی حالت پر جب وہ موت کے بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہو، تم دیکھو کہ گھر میں اس کے لئے کوئی راحت و مسرت نہیں، ناجایز آزادی نے یورپ کی عورت کو اتنا بگاڑ دیا ہے کہ اب ایک شوہر ایک منٹ کے لئے بھی اپنے گھر میں آرام نہیں پا سکتا۔ بیماری میں بیوی میاں سے دور رہتی ہے، مصیبت میں وہ اس کی شریک نہیں، مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ لڑنے کے لئے طیار، خرچ میں کمی ہو جائے تو طلاق پر آمادہ اور اگر شوہر اس کو کسی دوست سے نہ ملنے دے تو اس کی جان کی دشمن۔ پھر بیٹوں کے ساتھ ایک باپ کا سلوک دیکھو، ماں کی جگہ پتھر کی سل ہوگی، عیاشی میں منہمک ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی عمر میں اس کو علیحدہ کر دیں گے، نہ دکھ بیماری سے غرض نہ راحت و آرام سے، یہی حال دوستوں عزیزوں کا ہے، اور یہی حال کاروبار کا، غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک یورپین مرد یا ایک یورپین عورت یا بچہ پرسکون زندگی بسر کرتا ہو، عدالتوں میں رات دن طلاق کے مقدمات پیش ہوتے ہیں، آئے دن خودکشیوں کی اطلاعیں شایع ہوتی ہیں اور خودکشی کے روز روز نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ دس پندرہ لاکھ کی آبادی کے شہر میں ہزار ڈیڑھ ہزار طلاقیں اور چار پانچ سو خودکشیاں ہو جانی معمولی سی بات ہیں، غرض یورپ نے جس نظام پر اپنے تمدن کی بنیاد رکھی ہے وہ اتنا ناقص اور اسدرجہ مسموم ہے کہ اس سے ترقی اور فلاح کی امید رکھنی حماقت ہے، اسی نظام تمدن کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یوروپ کی آبادی کا عنصر غالب نہایت سخت کرب و بیچینی میں مبتلا ہے، اس کی زندگی سرتاپا مصیبتوں سے لبریز ہے نہ گھر میں اس کے لئے چین ہے نہ باہر آرام، نہ عورت کے لئے مسرت ہے نہ مرد کے لئے راحت، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ناجایز اولاد محتاج خانوں اور یتیم خانوں میں پلتی ہے، سیکڑوں امراض خبیثہ میں مبتلا ہو کر جانیں دیتے ہیں، اسی کے ساتھ یہ میلان بھی خطرناک سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ توالد و تناسل کا سلسلہ بند ہو جائے، اسقاط حمل کی روز نئی دوائیں ایجاد ہوتی ہیں اور عدم استقرار حمل کی دوائیں تو ہر جگہ دوا فروشوں کے ہاں بکتی ہیں۔ اس سے زیادہ یہ ہے کہ مائیں خود اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ہلاک کر دیتی ہیں، کوئی زہر دے کر سلا دیتی ہے اور کوئی سمندر میں ڈال دیتی ہے، صرف ایک شہر میں جس کی آبادی ۱۸ لاکھ ہے ایک برس میں چار ہزار اسقاط کی وارداتیں پیش آئیں، دو ہزار بچے یتیم خانوں میں داخل ہوئے۔ دس ہزار شیشیاں عدم استقرار حمل کی دواؤں کی فروخت ہوئیں اور دو سو بچوں کی زندگیاں ان کی ماؤں کے ہاتھوں ضایع ہوئیں۔

اب ان باتوں کو وحشی قوموں کے میلانِ دخترکشی سے ملاؤ اور بتاؤ کہ دُنیا نے کیا ترقی کی ہے؟ تلوار کے پھل اور ہلاکت کی رشمیں ڈوری کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ دونوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

پھر جب اجتماع بشری اپنی تمام قوتیں صرف کرنے کے بعد بھی مادی زندگی میں مطمئن و شاد کام نہ رہے تو ایسا تمدن قطعاً ترقی یافتہ تمدن نہیں ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے، کیونکہ اگر زمانہ ترقی کرتا تو عہدِ وحشت کی یہ رسمیں صورت بدل بدل کر نمودار نہ ہوتیں۔

خانگی زندگی سے ہٹ کر سوسائٹی کے نظام کو دیکھو، اس راہ میں ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں زہریلے کانٹے نہ بچھے ہوں، گوشہ گوشہ میں قاتل ہوں گے، قدم قدم پر ڈاکو ہوں گے اور نقصان پہونچانے والے بھائی بند ہوں گے یا دوست احباب، چوری، ڈاکہ، قتل، فریب کی وارداتیں روز ہوتی رہتی ہیں اور اس کو فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو خواہ وہ کتنی ہی عمدگی سے کی جائیں قابلِ نفرت ہیں۔

یورپ کو اپنی عقلیت پر بڑا ناز ہے کہ اس نے اخلاق اور اخلاقی احساس کو مٹا دیا۔ اول تو یورپ کا مذہب ایک ایسا مذہب تھا جس میں سرے سے ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی اور وہ فطرت انسانی کے اس کام کا علاج کرنے سے بالکل عاجز تھا، تاہم وہ سیاست واقتصادی اغراض سے زیادہ مضبوط زیادہ پائیدار اور زیادہ مستقل چیز تھی، لیکن یورپ نے اس کی عمارت کو بھی گرا دیا اور اس کی جگہ قومیت و وطنیت کی بنیاد قایم کی، لیکن اربابِ فہم واقف ہیں کہ قومی اور وطنی احساس نے اجتماعی زندگی کو جتنا نقصان پہونچایا ہے، اتنا نقصان نہ مذہب نے کبھی پہونچایا اور نہ کسی وحشی قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر ملتی ہے۔

اب یورپ میں ایک اور خیالی گھروندا طیار ہو رہا ہے اس کا نام حق انتخاب حکومت اور کفالت عامہ ہے، لفظی حیثیت سے یہ دونوں خیال بہت دل خوش کن ہیں، لیکن اندرونی حیثیت سے ان کی حقیقت اتنی دل خراش ہے کہ شاید زہر کی بھی اس کے سامنے کوئی اصلیت نہیں ہے، یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ یورپ کا فلسفۂ سیاست قول و فعل کے لحاظ سے ایک نہیں ہے، اس کے لفظ عمل کے مفہوم سے جدا اور عمل کی صورتیں لفظوں سے علٰحدہ ہیں۔ حق انتخاب حکومت کا یہ مفہوم ہے کہ دُنیا کی ہر قوم کو اختیار ہے کہ اپنے اوپر اپنی مرضی کے موافق جو طرز حکومت چاہے انتخاب کرے، لیکن عملی معنی یہ ہیں کہ زبردست کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ کمزور کے لئے جس طرز حکومت کو چاہے مقرر کر دے اور جس طرح چاہے اپنے اغراض کے لئے اس پر ظلم و ستم کرے، اسی طرح کفالت عامہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو اپنے فرایض کا احساس کر کے انسانی فلاح و بہبود کی جد و جہد کرنی چاہئے، لیکن اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ قومی جماعتوں کی باہمی مفاہمت، حیات اجتماعی کے لئے یہ دونوں چیزیں سخت مہلک ثابت ہوئی ہیں، حق انتخاب حکومت سوسائٹی کے امن و امان کا گلا گھونٹ رہا ہے اور کفالت عامہ قوموں کو جنگوں کی دعوت دے رہی ہے، موجودہ زمانہ میں دُنیا کے گوشہ گوشہ پر جو مادی کشمکش جاری ہے اور دن بدن نزاعیں بڑھتی جاتی ہیں ایسی کسی زمانہ میں نہیں ہوئی تھیں، دُنیا نے بہ حیثیت مجموعی اس سے پہلے نہ کبھی ایسی جنگیں دیکھیں، نہ پریشانیاں اُٹھائیں اور نہ اس طرح اقتصادی قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔

اس نظام تمدن نے سب سے بڑی بُرائی جو پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ انسان انسانوں کا خون پیتے ہیں، ان میں نہ دوستی ہے نہ محبت، نہ ہمدردی ہے نہ غم گساری، ہر شخص اپنی اغراض کا بندہ ہے، اپنی حرصوں کا غلام ہے اور اپنے فایدہ کے لئے دین، مذہب، شرافت و انسانیت، اخوت و برادری کو پامال کر دینے پر آمادہ، آج کل انسانی سوسائٹی کی جیسی بری حالت ہے اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کا گلا گھونٹے ڈالتا ہے اور وہ جتنا بدعہد بدطینت اور سفاک ہو گیا ہے ایسا کبھی نہیں تھا، یہ عام بات ہے کہ ایک کے گھر میں آگ لگتی ہے، اور سو تماشائی جمع ہو جاتے ہیں، لیکن جن ملکوں پر مغربی تہذیب کا اثر زیادہ ہے وہاں دوست احباب آگ بجھانے کے نام سے گھر کی اچھی اچھی چیزیں لوٹنے کو آجاتے ہیں اور جب انسانی فطرت کی وحشت و حیوانیت اور اجتماع بشری کی پستی و زبونی کا یہ عالم ہو تو یہ کہنا کہ اجتماع انسانی ترقی کر رہا ہے، کس قدر بے بصری ہے، اگر ترقی اسی بداخلاقی کا نام ہے تو بتاؤ تنزل کو کہاں ڈھونڈیں اور زوال اخلاق کا دُنیا کے کس گوشہ میں پتہ لگائیں؟ جب تک فطرت اجتماعی کے نظام عمل کی یہ ابتری قایم ہے، جب تک انسان اتنا خود غرض ہے اور جب تک

ہر شخص دُنیا بھر کے فایدوں کو اپنے ہی لئے حاصل کرنا چاہتا ہے، اس وقت نہ دُنیا ترقی کر سکتی ہے نہ امن کی فضا پیدا ہو سکتی ہے، نہ باہمی اعتماد و اعتبار پایا جا سکتا ہے اور نہ دُنیا کے اخلاق میں نیکی کا میلان ۔ خود غرضی حیوانی فطرت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا خاصہ ہے، جب تک یہ ہے اس وقت تک دنیا ہمیشہ معرکہ کارزار بنی رہے گی اور جو قومیں ترقی میں صرف ہونی چاہئیں وہ باہمی کشمکش اور کشت وخون میں صرف ہوتی رہیں گی ۔

الغرض موجودہ حالات میں یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ دُنیا ترقی کر رہی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کے پاس اخلاق عالیہ کا جو کچھ اندوختہ تھا اسے بھی کھو چکی ہے اور وحشت وحیوانیت میں اتنا ڈوب گئی ہے کہ اب اس کے آگے کوئی درجہ ہی نہیں ہے

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسان کیمیاوی اکتشافات کی ان بلندیوں پر پہونچ گیا ہے جن بلندیوں کا اس سے پہلے خیال ہی نہ تھا لیکن جس طرح اور دعوے بے بنیاد ہیں، اسی طرح یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے ۔ موجودہ کیمیاوی عہد کی پیداوار میں وہ کونسی نئی چیز ہے جس کا اکتشاف اسی دور میں ہوا ہے ؟ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، لاسلکی، ان میں سے کونسی چیز ہے جو بالکل نئی ہے جو بالکل نئی ہے اور جسے اس سے پہلے کے دماغ نہیں سوچ چکے ہیں ؟ کلدان، مصر، اشور، نینور، چین، ایران، ہندوستان، یمن، یونان اور پھر عہدِ اسلامی کی تاریخیں اُٹھا کر دیکھو ان میں سے ہر ہر چیز کا نشان وہاں پاؤ گے، ہر خیال کی بنیاد وہاں ملے گی ۔

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسان کی دسترس ان کمالات تک ہو گئی ہے جو انسان کی قدرت سے باہر تھے، لیکن تاریخ کی آواز اس کا بھی بطلان کرتی ہے، موت وزیست کا مسئلہ انسانی اختیار سے اب بھی اسی طرح باہر ہے جس طرح ابتدائے آفرینش میں تھا، ناگہانی حادثات اب بھی اسی طرح پیش آتے رہتے ہیں جس طرح اب سے پہلے آتے تھے اور انسان اب بھی اسی طرح بیمار پڑتا ہے جس طرح عہد قدیم میں بیمار پڑتا تھا، علاج پہلے بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے دوائیں پہلے بھی استعمال ہوتی تھیں ۔ اب بھی ہوتی ہیں، عمل جراحی پہلے بھی ہوتا تھا اور اسی طرح اب بھی ہوتا ہے ۔ کیلی فورنیا کے علاقہ میں ایک گڑھے سے حال میں ایک انسانی ڈھانچ نکلا ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ کم از کم ۲۰ ہزار برس قبل کا ہے، ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ اس کا سر ٹوٹ گیا تھا، آپریشن کے نشانات اس کے مجمجہ پر موجود ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اب آپریشن کیا جاتا ہے اسی طرح وحشی قومیں بھی آپریشن کرتی تھیں، یہی حال دواؤں کا ہے، کوئی نئی دوا اس عہد میں پیدا نہیں ہوئی ہے، تمام دوائیں پہلے کی دریافت کی ہوئی ہیں، اب صرف ان کی صورتیں بدل گئی ہیں ورنہ ان کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اگر زیادہ حق بیانی سے کام لیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا نے اس حیثیت سے بھی تنزل کیا ہے ۔ پرانے لوگوں کو جو دوائیں معلوم تھیں اور اب بھی وحشی قوموں کو جو دوائیں معلوم ہیں، جن جڑی بوٹیوں پر انھیں اطلاع ہے ترقی یافتہ فضا میں سانس لینے والے بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو بھی ان کی خبر نہیں ہے، ان کی دواؤں کا یہ حال ہے کہ اور ازدیاد مرض کا باعث ہوتی ہیں، ان کے استعمال سے نظام عصبی کمزور ہو جاتا ہے، ہمیشہ نئے نئے روگ لگتے رہتے ہیں اور قلب وروح کو اب گھن لگ جاتا ہے کہ مرتے مرتے پیچھا نہیں چھوڑتا حالانکہ اس عہدِ ترقی سے پہلے نہ بیماریوں کا اتنا زور تھا نہ دوائیں اتنی ناقص تھیں اور نہ طبیب اتنے اندھے آج ہزار ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے جو مرض کو پہچان لے، حالانکہ وہ زمانہ جس کو عہدِ وحشت وجہالت کہا جاتا ہے سو میں دس طبیب ایسے رکھتا تھا جو مرض کی تخلیق سے پہلے چہرہ کے رنگ سے جان لیتے تھے، کہ فلاں مرض ہونے والا ہے اور اسی وقت سے اسکی روک تھام شروع کر دیتے تھے ۔

پھر بتاؤ کہ جب دُنیا نے اس میں بھی ترقی نہیں کی تو کس بات میں ترقی کی ہے ؟ بورئے اور فرشِ مخمل کو نہ دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ پہلے کیا نہ تھا جو اب ہو گیا ہے ؟

مدعیان ترقی کا دعویٰ ہے کہ اجتماع انسانی جو سیاسی آزادی اس زمانہ میں حاصل کی ہے اور جو قانونی عضو بندی اب ہو گئی ہے اس سے پہلے اس کا وجود بھی نہیں تھا، لیکن اس حالت میں جبکہ مغربی چاقو مشرقی رگِ جاں کاٹ رہا ہے، جبکہ مغربی قومیں دُنیا کو غلام

بنانے کے درپے ہیں جبکہ امریکہ میں ریڈ انڈین نسل کا علانیہ قتلِ عام کیا جاتا ہے جبکہ چینی اور ہندوستانی حقوقِ شہریت سے محروم کئے جاتے ہیں، اور جبکہ قوی کا کمزور کو ہلاک کر دینا ضروری اقتضا ہے اور نسل و رنگ کے ساتھ تہذیب و آئین کا بدل جانا لازمۂ انسانیت ہے تو اس دعوے کی بنیادیں کھوکھلی نظر آتی ہیں۔ اس سیاسی عضو بندی اور جمہوریت و آزادی کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرتی ہے، جس طرح آزادی و انصاف کے علمبردار دوسری قوموں کا خون چوستے ہیں اور جس طرح گورا کالے کو مارے ڈالتا ہے، اس طرح گزشتہ زمانہ کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

بلاشبہ قانون کا اصول بہت دلآویز ہوتا ہے، جمہوریت کا نظام نہایت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جب قول کو فعل سے اور الفاظ کو عمل سے تطبیق دیجاتی ہے، تو باوصف اس کے کہ قانون کو اتنا لچکدار بنایا ہے کہ وہ آسانی سے مظالم کے ساتھ مل جاتا ہے، لیکن پھر بھی عمل میں جو تناقض رہ جاتا ہے وہ اتنا عظیم الشان ہوتا ہے کہ الفاظ سننے والے عملی وحشت و درندگی کا تصور نہیں کر سکتے اس عہدِ آئین و حریت کا جب سے آغاز ہوا ہے اس وقت سے اب تک کی تاریخ اپنے اندر اتنے مظالم رکھتی ہے کہ وحشی زمانہ کی پوری بارہ صدیاں بھی اتنے مظالم بھی پیش نہیں کر سکتیں وہ سیاسی بیدردی و تجارتی سفاکی، وہ اقتدار پسندانہ وحشت جس نے ساری دنیا کو ہلاک و برباد کر دیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی، پہلے دشمن، دشمن بن کر سامنے آتا تھا، پہلے ظالم ظلم کے نام سے اپنی قوت دکھاتا تھا، پہلے لڑنے والا ہتھیار چھین کر نہیں لڑتا تھا لیکن اب دوست بن کر گلا دبایا جاتا ہے، اب عدالت و انصاف کے نام سے ظلم کئے جاتے ہیں، اب ہتھیار چھین کر اور دھوکہ دے کر حملے کئے جاتے ہیں اور محض اس لئے کہ دوسری قومیں ابھرنے نہ پائیں اور مخالف قوموں کی حریف نہ بن سکیں، پھر کون کرتا ہے؟ وہ جو سب سے زیادہ آزادی کے دعویدار ہیں، وہ جو بنی نوع انسان کی ہمدردی کے مدعی ہیں وہ جو دنیا بھر میں اصلاح و ترقی کے ناشر ہیں وہ جو امن و انتظام، ادارہ و قانون کے پیغمبر ہیں۔

پھر بتاؤ کیا یہی اخلاق و انسانیت کی ترقی ہے، جس نے یہ صورتیں اختیار کی ہیں؟ کیا یہی وہ نقطۂ عروج ہے جس پر پہونچنا مغرب اور اس کے ہواخواہوں کے لئے باعثِ ابتہاج و مسرت ہے؟ یہ باتیں اگر وحشی قومیں کریں تو قابلِ اعتراض نہیں ہیں، لیکن انصاف و انسانیت کے فرشتوں کا انسانیت کے فرشتوں کا ایسا کرنا حد درجہ سزاوارِ لعنت و نکوہش ہے، ہمیں معلوم ہے کہ ان عیاروں نے ایسی سوسائٹیاں بنائی ہیں، جن کا مقصد جانوروں پر ظلم کا انسداد ہے لیکن کیا وہ انسانوں پر بھی ظلم سے باز آگئے ہیں؟ وہ ایک فیاضانہ سلوک کر کے اپنے دوسرے مظالم کو چھپانا چاہتے ہیں، وہ حیوانوں پر رحم کر کے انسانوں پر ظلم کا ہاتھ دراز سے دراز تر کرنا چاہتے ہیں وہ یہ تو کہتے ہیں کہ گھوڑے کو ایذا نہ دو لیکن خود انسان کو ایذا دینے میں دریغ نہیں کرتے، جن لوگوں کے اخلاقی عیاری کا یہ حال ہو، جو لوگ اس درجہ بے پناہ سفاک ہوں، ان کی حکومت و اقتدار میں عدل و انصاف کا کیا ذکر، پھر ہم جانتے ہیں کہ جانوروں پر یہ رحم کیوں ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ وہ جانور بے تکلف ذبح کر ڈالے جاتے ہیں جو غذا کا کام دیتے ہیں اور ان پر رحم کی تلقین کی جاتی ہے جو خدمت کرتے ہیں، یعنے دوسرے لفظوں میں موجودہ عہد حق و انصاف کے اعمال اجتماعی جن بنیادوں پر قایم ہیں، وہ خود غرضی، سفاکی، بے ایمانی اور خود بینی کی چٹانیں ہیں۔

پس جب بنیاد ہی اتنی خراب ہو تو عمارت کیسے اچھی ہو سکتی ہے، ایسی ناقص اور ناکارہ اجتماعی زندگی کی ترقی پر استدلال کرنا اور یہ کہنا کہ موجودہ زمانہ میں دنیا نے عظیم الشان ترقی کی ہے، محض کذب و افترا ہے، کیونکہ اس حیثیت سے دنیا اور گر گئی ہے۔

ان پیغمبرانِ ترقی کو یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس زمانہ میں دنیا نے جو علمی ترقی حاصل کی ہے جو نئی نئی باتیں دریافت ہوئی ہیں، قومی حکومتوں نے علوم و فنون کی جو سرپرستی کی ہے اور جمہوریتوں کے طفیل میں حیاتِ اجتماعی جس سعادت کا مزہ سے بہرہ اندوز ہو گئی ہے، اس سے پہلے کے لوگ نہ ایسی زندگی کا تصور کر سکتے تھے، نہ ان کے خواب میں کبھی ایسی فضا کا خیال آیا تھا، لیکن جس طرح اور دعوے بے بنیاد ہیں اسی طرح یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے، اس عہد کی ساری ترقی کا دارومدار پچھلوں کے اصولوں، ان کی دریافتوں اور

موشگافیوں پر ہے، علمی حیثیت سے موجودہ زمانہ نے صرف اتنی ترقی کی ہے کہ پہلی باتوں کو نئے انداز میں بیان کر دیا ہے اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیش نہیں کی، کشمکش نفس، مسئلۂ ارتقا، انتخاب طبیعی جو اس عہد کی پیدا وار میں سب سے بلند در بہ رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب نظریے آج سے ایک ہزار برس پہلے قایم ہو چکے تھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ امتیاز کے قابل کون ہے، وہ جو داغ ہو یا وہ جو نقال ہو؟

رہی حکومتِ عامہ کی علمی سرپرستی سو وہ بھی صرف فنون لہلکہ تک محدود ہے، علوم کی جو سرپرستی آج سے ایک ہزار پہلے کی جاتی تھی وہ تو تقریباً معدوم ہے، کیونکہ اب علوم کی سرپرستی اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس سے کوئی دماغی تربیت حاصل کی جائے، یا اس سے مقصود عادات و اطوار و خیالات کی اصلاح ہو، بلکہ علوم صرف نفسانی اغراض کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے مسابقت کی جو کوشش کرتی ہے اس کے اندر بھی یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ وہ دوسری قوم کو شکست دیدے، اس کے لئے یونیورسٹیاں قایم ہوتی ہیں اسی کے لئے ریل، ڈاک، تار، جہاز وغیرہ میں نئی نئی ایجادیں کی جاتی ہیں، اسلحہ طیار کئے جاتے ہیں، ڈائنامائٹ، گولہ بارود، زہریلی گیس توپیں اور بندوقیں بنائی جاتی ہیں اور حکومتیں لاکھوں روپے کے انعامات دیتی ہیں، اس سے غرض صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان آلات کے زور سے اپنی تجارت کے لئے ایک نیا بازار پیدا کیا جائے اور دوسری قوم ان چیزوں کو دیکھ کر اتنی ڈر جائے کہ کوئی مزاحمت نہ کرے اور ان کے طمع کے لئے راستہ صاف کر دے۔

عام خیال ہے کہ اجتماعی ترقی کے لئے جمہوری حکومت بہترین معاون ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں صرف اسی عہد میں تکمیل کو پہونچی ہے لیکن اول تو موجودہ عہد جمہوریت جمہوریت کے نام ہی سے ناآشنا ہے، کیونکہ وہ جمہوریت کے نام سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ مستبد قومی حکومت ہے جو اپنے سوا نہ کسی کو انسان سمجھتی ہے۔ نہ اس کے نزدیک دنیا میں کسی اور کو زندگی کا حق حاصل ہے، دوسرے اجتماعی فرائض کے نقطۂ نظر سے جمہوری حکومت اور شخصی سلطنت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، ایک جگہ ذمہ دار صرف ایک ذات ہوتی ہے، دوسری جگہ ذمہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں اور مختلف لوگ مقتدر ہوتے ہیں اور اس سے حکومت کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آتا، جو قوت شخصی حکومت میں کام کرتی ہے، وہی جمہوری میں بھی کام کرتی ہے، جس طرح وہ خونریزی کی اجازت دیتی ہے، اسی طرح یہ اپنے نفع کے لئے خون بہانے میں تامل نہیں کرتی، وہاں صرف ایک شخص کی مرضی سے خون بہتا ہے یہاں قوم کے متعدد افراد کی مرضی شامل ہے۔

بہرحال دنیا نے کسی حیثیت سے کوئی ایسی ترقی نہیں کی جس پر موجودہ عہد فخر کر سکے اور جسے ہم ترقی کہہ سکیں۔

رعایتی اعلان

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات — مکتوبات نیاز تین حصے —
مغفرہ ۸ للہ ۴ ۵ للہ ۴ عدد ۱۲

انتقادیات — ماہ و ما علیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت — فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید —
للہ ۴ عا ۴ عا ۴ عا ۴ عد ۴ عد ۴

نقاب اٹھ جانے کے بعد۔

میزان
عدد ۵۲

۸/

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

مولانا شبلی، علی گڑھ سے پہلے اور بعد

(مفتون احمد)

علی گڑھ سے پہلے فروری ۱۸۸۳ء کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ مولانا شبلی اعظم گڑھ کے محلہ کرمی ٹولہ میں اپنے دو منزلہ مکان سے باہر نکلے اور چوک کی طرف چل دئے۔ آج صبح سے فضا کہرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ رات ضرور کہیں ژالہ باری ہوئی تھی۔ سڑک پر اکا دکا یکے گزر رہے تھے۔ مریل گھوڑے اور گندی دھوتیوں اور بڑھی ہوئی داڑھیوں والے یکہ بان ٹخ ٹخ کی یکساں آوازوں کے ساتھ کچہریوں کی طرف رینگتے جا رہے تھے۔ بعض جگہ مہتر جھاڑو لئے ہوئے سڑکوں کی صفائی کر رہے تھے۔ ان مہتروں کو جہاں دیکھئے ایک ہی وضع، ایک ہی لباس، ایک ہی رنگ، ایک ہی زبان کے ملیں گے۔ چاہے وہ یوپی کے میدانوں میں ہوں یا بنگال کی دلدلوں میں یا سندھ کے ریگستانوں میں، ان کے مرتبے اور شکل وصورت میں ایک خطرناک مشابہت ملے گی، گویا انسانی بول و براز نے ان کے جسم اور روح تک کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا تھا۔ شبلی نے اپنا مفلر کس کر گلے میں لپیٹ لیا۔ کچہریوں کی طرف جاتے ہوئے جھولتے ہوئے ڈگمگاتے ہوئے یکوں کو دیکھ کر ان کے دل میں کراہت پیدا ہوئی انھوں نے ۱۸۷۹ء میں وکالت کا امتحان دیا تھا اور فیل ہو گئے تھے، جبکہ ان کے چھوٹے بھائی مہدی نے کسی کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے بغیر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ خیر اگلے سال مولانا بھی جوں توں کر کے پاس ہو گئے مگر دل وکالت کرنے میں خاک نہ لگا اور اُدھر مہدی امتحان پاس کر کے اب بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت تک جانے کی سوچ رہے تھے، اور ضلع کے کلکٹر نے یہ سن کر خوش ہو کر شبلی کے والد سے کہا تھا:-

"ویل شیخ صاحب، ہمیں امید ہے کہ جب آپ کا بیٹا ولایت سے تعلیم پا کر واپس آئے گا تو وہ مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کا بھی ایک لائل سرونٹ ثابت ہوگا۔"

"اونہہ، لائل سرونٹ"، شبلی نے سوچا، انگریزوں کو خوش رکھنے کا کیا اچھا نسخہ سرسید نے ایجاد کیا تھا۔ مگر اسی لائلٹی کی بدولت تو ان کے والد کی گورنمنٹ میں اتنی عزت تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں بھی کر جائے۔ خدا کا کتنا بڑا احسان تھا۔

"اے مولوی شبلی، ادھر تو آؤ، تمہارے لئے نئی نئی کتابیں منگائی ہیں۔" کسی نے آواز دی۔ مولانا شبلی سوچنے لگے۔ کیا مضایقہ ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کتب فروش سے گپ شپ کر لی جائے۔ مگر پھر انھیں یاد آیا کہ ان کو ایک ضروری کام ہے، چنانچہ جواب دیا۔

"نہیں بھئی آج ہمیں فرصت نہیں۔"

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ گھنٹوں اس کتب فروش کے یہاں بیٹھ کر اُردو کے دیوان اور مختلف کتابیں الٹتے پلٹتے لیکن آج، جیسا کہ انھوں نے کہا، ان کو فرصت نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چھاؤنی کی طرف چل دئے جہاں ان کے والد اور سوتیلی والدہ رہا کرتی تھیں۔ آج انھوں نے بال ترشوائے تھے اور داڑھی بھی اور ایک نئی صدری اور دُھلا ہوا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ یکایک مشن اسکول کا گھنٹہ ٹن ٹن بجنے لگا اور لڑکے ایک ساتھ مل کر گانے لگے "گاڈ سیو دی کنگ"۔ شبلی کو اس گھنٹے سے اللہ مارے کا بیر تھا۔ اس گھنٹے کی ضرب اس بات کا اعلان تھی کہ ہندوستانیوں کی ایک نسل انگریزی زبان اور تہذیب میں رنگی جا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ انھیں انگریزی زبان سے کوئی دشمنی تھی لیکن خود انھیں اس انگریزی نے کیا فایدہ پہونچا تھا۔ خود تو وہ عربی فارسی اور اُردو کے ماہر تھے۔

راستے میں ایک داروغہ صاحب مل گئے۔ کہنے لگے "کہو بھئی مولوی شبلی - آج کل کیا کر رہے ہو - بھئی کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہئے - بے کار سے بے گار بھلی - تمھاری وکالت کا کیا حال ہے؟"

اور شبلی نے سوچا - وکالت میرے بس کی نہیں ہے - میں جھوٹ بول کر اپنے موکلوں سے ایک کے چار نہیں وصول کر سکتا - اور یہ داروغہ - کیا وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا چہرہ کیوں سُرخ ہوتا جا رہا ہے - اس کی توند کیوں پھولتی جا رہی ہے - اس کی کلائیوں پر یہ پچاس روپے کی گھڑی کہاں سے آئی ہے - رشوت کا مال - چلا ہے مجھے نصیحت کرنے - تمھاری وکالت کا کیا حال ہے - میاں کوئی نئی بات کہو - کچھ موسم کی گفتگو چھیڑو - کچھ گھر کا حال احوال بیان کرو - انگریزوں سے سبق سیکھو میاں - نوکری ہی سب کچھ نہیں ہے -

نوکری ہی سب کچھ نہیں ہے - مگر شبلی دیکھ رہے تھے کہ ان کے شہر میں نوکروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، اور دیہات کے کسان تک بمبئی اور کلکتہ بھاگے جا رہے تھے، جہاں انھیں نوکری مل جاتی تھی -

—— ہاں نوکری تو کہیں تلاش کرنا تھی -

یہ بات ان کے دماغ سے دن بھر محو نہ ہو سکی، اس پر طرہ یہ کہ ایک ہندو وکیل صاحب ملے تو لگے وہی بڑ ہانکنے "بھئی معاف کرنا مولوی شبلی - تم میرے دوست شیخ جی کے بیٹے ہو - یوں بے کاروں کی طرح تمھیں گھومتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے - اب میرے بھتیجے کو لو - بی - اے پاس کر کے کلکتہ پہونچ گیا اور ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہو گیا - پچاس روپے کما رہا ہے - ہیں گھر بھیجتا ہے - ابھی ابھی بہن کی شادی بڑے ارمانوں سے اُس نے کی ہے - اور بیوی بچوں کے نام سے تو کان پر ہاتھ دھرتا ہے - نا - بابا، یہ جنجال مجھ سے نہ اُٹھے گا - خیر اگر وہ بیوی بچے نہیں چاہتا تو نہ چاہے مگر چار پیسے کما تو لیتا ہے - دُنیا میں چار پیسے ضروری ہیں، بیوی بچے ضروری نہیں ہیں عزت ضروری ہے - تسکین ضروری نہیں ہے - ہمارے رشی منی جنگلوں میں رہا کرتے تھے تو کیا ان کے لئے حوریں آجاتی تھیں - بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ مسلمان ہیں ہی تعلیم میں پیچھے - اب تم نے عربی، فارسی پڑھی ہے - کیا وقعت ہے تمھاری - پڑھیں فارسی بیچیں تیل - وہی مثل ہے - چہ خوبی یوں کام نہیں چلنے کا"

شبلی کے دل میں ہندو وکیل کا یہ جملہ کانٹے کی طرح چبھنے لگا - تم میرے دوست شیخ جی کے بیٹے ہو - یوں بے کاروں کی طرح تمھیں گھومتا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے - یہ پھانس باوجود کوشش کے سینے سے نہ نکل سکی اور کھٹکتی رہی، اور ان کا جی چاہا کہ وہ ابھی گھر جا کر اپنی تمام اُردو غزلیں اور فارسی تحریریں پھاڑ کر پھینکدیں -

اب چھاؤنی قریب آگئی تھی - اس کے آس پاس یکوں، بگھیوں اور پالکیوں کا ایک میلا سا لگ رہا تھا - یہ وہ موکل تھے جو شبلی کے والد کے پاس اپنے مقدموں کے سلسلہ میں دُور دُور سے آتے تھے - ہر روز یہی حالت ہوتی تھی - شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے موکلوں اور گواہوں کو کچھ سمجھا رہے تھے ان کا ماتھا چوڑا اور چوکور تھا، داڑھی گھنی، ناک ستواں اور رنگ گندمی - بھویں بھی بڑی گھنی تھیں، شبلی کو دیکھتے ہی بہت سے لوگوں نے راستہ دیدیا - معاً ان کے والد کی نگاہ ان پر پڑی -

"اخاہ، مولوی شبلی صاحب ہیں - آیئے ہم آپ کے لئے کچھ رکھتے ہیں"

شبلی خاموش رہے -

"ہم آپ کے لئے کچھ رکھتے ہیں" - دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر کہا -

شبلی نے چاہا کہ لپک کر کاغذ لے لیں پر ہمت نہ پڑی - وہ منتظر رہے -

اس میں لکھا تھا: - "آپ کی درخواست کے حوالے سے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ کا تقرر اس کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے کر لیا گیا ہے"

دستخط - پرنسپل محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج، علی گڑھ

کاغذ شبلی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا -

علی گڑھ میں

اُن کے چچازاد بھائی شیخ عثمان احمد مرحوم متوفی ۸ راگست ۱۹۵۰ء کی زبانی :-

۱۸۸۵ء کے موسم سرما میں مجھ کو بھائی مولانا شبلی مرحوم کے یہاں علی گڑھ جانے اور رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اُس وقت شہر میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اُن کا نوکر، مولوی غفور صاحب اور دو ایک طالب علم بھی فروکش تھے۔ ان کا اپنا کمرہ نہایت صاف ستھرا اور مختصر اسباب پر مشتمل تھا۔ اس مکان کا نقشہ انھوں نے ایک خط میں اس طرح کھینچا تھا:

"میں جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے۔ یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے۔ دکھن کی طرف ایک خوشنما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے۔ اس میں خاص میں رہتا ہوں۔ ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے۔ دیوار صدر مقام کے دائیں جانب ٹرکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے۔ دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے۔ اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحٰق کی سکونت کی جگہ ہے، اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے۔ کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک مشہور شاعر جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اُردو ہیں، رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر ملتے ہیں۔ قیس تخلص کرتے ہیں۔ خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں اور بفضلہٖ عمدہ طور سے ملتے ہیں۔ میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے۔ میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سُنے اور داد دی۔ مدرسہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔"

خیر صاحب میں نے دروازے پر دستک دی۔ ملازم نے آکر دروازہ کھولا اور اندر لے گیا۔ بھائی شبلی مرحوم نے دیکھتے ہی مجھے پکارا:- "آؤ میاں عثمان"۔ میں چھٹیوں میں گھر گیا ہوا تھا اور اب وہیں سے آرہا تھا، اس لئے گھر کے حالات تفصیل سے بیان کئے۔ بولے کہ "میں چاہتا ہوں، میرے عزیز کم از کم سال میں ایک بار میرے یہاں آیا جایا کریں۔ میں نے بارہا عزیزم سمیع اور چچا صاحب قبلہ کو لکھا مگر کسی نے ہامی نہیں بھری۔ تمھاری اچکن کہاں ہے۔ چلو سید صاحب سے مل آئیں"۔ میں نے کہا اچکن گھر چھوڑ آیا۔ یہ سُن کر ملازم کو آواز دی اور اپنی اچکن منگوا کر مجھے پہنائی۔ اچکن میرے جسم پر تنگ آتی تھی۔ آستینیں پھنسی پھنسی تھیں۔ دیکھ کر مسکرائے اور اپنی صحت کا رونا رونے لگے۔ قبض رہتا ہے کبھی کبھی بخار بھی آجاتا ہے۔ علی گڑھ کا ملیریا!

ہم لوگ سرسید کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ وہ اس وقت اپنی کوٹھی (موجودہ انگلش ہاؤس) میں مقیم تھے۔ بھائی مرحوم دیر تک ان کے یہاں رہے اور ان کے کتب خانے میں مختلف کتابیں دیکھتے رہے۔ کسی بات پر ان میں اور سرسید میں بحث چل پڑی۔ ہاں یاد آیا۔ اسی وقت ایک سائل دروازے پر بھیک مانگنے آیا تھا، سید صاحب نے اسے دھتکار دیا۔ بھائی شبلی نے ٹوکا اور بحث چل پڑی۔ بعد ازاں ہم نے سید صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اور رخصت ہوئے۔

سید محمود سے بھی ملاقات ہوئی اور آرنلڈ سے بھی۔ آرنلڈ سے مولانا فرنچ سیکھتے تھے اور آرنلڈ ان سے عربی۔ سید محمود اُس زمانہ میں جج کے امیدوار تھے اور مولانا کے بڑے معتقد۔ مولانا بھی ان کی قابلیتوں کے نہایت معترف تھے۔ کہتے تھے کہ "سید محمود آج کل کالج میں روزانہ دو گھنٹے پڑھاتے ہیں۔ ایف اے اور بی اے کے لڑکوں کا بیان ہے کہ ہم نے آج تک ایسی تعلیم نہیں دیکھی۔ ان کی کثرت معلومات، طرز ادائے مطالب اور وسعتِ تحقیق پر سب کو حیرت ہے"۔

سرسید کے متعلق باتیں شروع ہوئیں تو بولے کہ میں نے احمد علی صاحب سے سید صاحب کے لئے سرکے کی فرمائش کی تھی مگر بندۂ خدا نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ سید صاحب کا مجھ پر بڑا کرم رہتا ہے۔ میرے علاج کے لئے انھوں نے میرا دہلی جانا تجویز کیا ہے۔ سید حامد (سرسید کے بڑے لڑکے) میرے ساتھ جائیں گے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نینی تال بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ تم سید صاحب کے لئے "مصطلحات الشعراء" تلاش کر کے بھیجو۔ ان کی تاکید ہے۔

نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی بابت میں نے عرض کیا کہ اس کی حالت دگرگوں ہے۔ فرمایا کہ ہاں، مدرس تنخواہوں پر جھگڑا کرتے ہیں۔ انٹرنس یا اس مدرس تیسری یا چوتھی جماعت کو بھی معقول طریقے سے انگریزی نہیں پڑھا سکتا، اس لئے موجودہ حالت سے کیا تسکین ہوسکتی ہے۔ جو لڑکے مدرسے میں نئے داخل ہوں ان کا نام و نسب مجھے معلوم ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ ان کی فیس داخل ہوتی ہے یا نہیں۔

اپنے عزیزوں کی باتیں ہوئیں تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا کو اپنے والد کے ہمہ کی بڑی فکر تھی جو انھوں نے اپنی دوسری بیوی کے نام لکھدیا تھا۔ پھر بولے کہ مہدی (مولانا شبلی کے چھوٹے بھائی) نے ولایت سے لیڈیوں کے ناچ وغیرہ کے بارے میں والد صاحب کو خطوط لکھے ہیں اور والد قبلہ ان کو سناتے پھرتے ہیں۔ مولانا نے بھائی مہدی کا ایک خط مجھے دکھایا جو انھوں نے ۳۰ اپریل ۱۸۸۵ء کو ولایت جاتے ہوئے بمبئی سے لکھا تھا، اور بمبئی کی دلکشی کی تعریف کے ساتھ ایک انگریز لیڈی اسکاٹ اور ان کے شوہر کے حسن اخلاق کی تعریف کے بعد یہ بھی لکھا تھا کہ "یہ لیڈی صاحبہ مجھ کو اسی قدر یا شاید زیادہ بھلی معلوم ہوئیں جس قدر آپ کو لیڈی بلنٹ صاحبہ"۔ یہ لیڈی بلنٹ صاحبہ کون تھیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن جب میں نے حیات جاوید پڑھی تو اس میں ایک جگہ کسی بلنٹ صاحب اور ان کی بیگم کا ذکر ملا جو پارلیمنٹ کے ممبر تھے، علی گڑھ کالج کا معائنہ کرنے آئے تھے، اور کالج میں ان کے ڈنر کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی لیڈی بلنٹ صاحبہ ہوں اور مولانا اس موقع پر ان کے اخلاق سے متاثر ہوگئے ہوں۔

سہ پہر کو اسٹریچی ہال میں عظیم الشان جلسہ تھا، ملکۂ معظمہ نے اپنی تصنیف کردہ دو کتابیں دارالعلوم کمیٹی کو بھیجی تھیں۔ اس کے شکریہ کا یہ جلسہ تھا۔ ہم نے بھی شرکت کی اور خوشی میں حصہ لیا۔

شام کو میر اکبر حسین اکبر الہ آبادی تشریف لائے، اور کہا کہ بھئی شبلی صاحب مشاعرے میں نہیں چلوگے اور اسی وقت یہ اشعار کہہ اور مولانا کو اپنے مکان پر مدعو کیا۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی، ہے صاف یہ بات بھائی شبلی
حاضر ہے جو کچھ کہ دال دلیا سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

اس میں لطف یہ تھا کہ بھائی مرحوم کے نام شبلی کے ساتھ دوسرا قافیہ بندھتا نہ تھا اکبر نے اسی کمال کو کر دکھایا۔ اُس زمانہ میں داغ اور حالی کی دہلی میں خوب معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ دو تین غزلیں اخباروں میں بھی چھپی تھیں۔ مولانا شبلی کو بھی اسی وجہ سے شعر و شاعری کا شوق زیادہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی اس کی لمبائی اور اسٹاف کی طرف سے خاطر خواہ داد ملی۔ میں اس غزل کے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں:

تیس دن کے لئے ترک مئے و ساقی کر لوں — واعظ سادہ کو رندوں میں تو راضی کر لوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمر گزشتہ کی تلافی کر لوں،
کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل — غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

غرض دیر تک محفل مشاعرہ گرم رہی۔ علی گڑھ کے طلباء میں اس وقت بہت سے ایسے تھے جو بڑا بلند ادبی مذاق رکھتے تھے اور آئندہ چل کر ان میں سے چند بڑے پائے کے ادیب اور شاعر نکلے۔

راستے میں میں نے عرض کی کہ آپ نے تو اعظم گڑھ کی طرف رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کہنے لگے کیا بتاؤں، تجربہ کر چکا ہوں۔ بہتیرا آزمایا لیکن اعظم گڑھ میری قسمت میں نہیں ہے۔ وہاں میں چھ ماہ سے زیادہ نہیں ٹک سکتا۔ دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ اگر کوئی ہو تو بتاؤ ——

میں نے اس آخری فقرے کی معنی خیزی پر توجہ نہ کی اور دوسری باتوں میں مشغول ہوگیا۔

انتخاب کلام صادق

صادق ایک نوجوان شاعر ہیں جو کسی وقت بہار و بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب ڈھاکہ کی "مردم کش" اور "صحت آزار" فضا میں حد درجہ سوگوارانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چھیننا اور کچھ نہ دینا زمانہ کا دستور ہے، لیکن جب وہ شاعر سے اس کا سکون چھینتا ہے تو کچھ دے بھی جاتا ہے۔ صادق کی شاعری اس کا یہی عطیہ ہے اور عطیہ بھی کیسا!

شمع کشتند و ز خورشید فشانم دادند
نیاز

کسی عالم میں اُن کو کہہ گئے تھے بے وفا ہم بھی
مگر اب تک یہ عالم ہے پشیمانی نہیں جاتی

کرتا ہے جب بھی کوئی نشیمن کا تذکرہ
آتا ہے چاروں سمت نظر بس دھواں مجھے

اب تک ہے مجھ کو آخری منزل کا انتظار
اب تک وہیں ہوں چھوڑ گئے تم جہاں مجھے

بہ وقتِ رخصت ان آنکھوں میں ہائے وہ آنسو
اور اس پہ کوششِ ناکام مسکرانے کی

اک تبسم کی کیا حقیقت ہے
مگر اس کی سزا بہت کچھ ہے

ہم وہ ہیں کہ ہنس دیتے تھے کانٹوں کی چبھن پر
اب دل پہ گراں بار ہے پھولوں کی ہنسی بھی

کچھ فطرتاً ایسی ہے طبیعت مری صادق
ہنستا ہوں تو آجاتی ہے آنکھوں میں نمی بھی

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اے دوست
بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اے دوست

نہ جانے کیوں تری قربت کے بھی حسیں لمحات
گراں گزر گئے دل پر کبھی کبھی اے دوست

سیہ نصیب نہ مجھ سا بھی ہو زمانے میں
ترے بغیر گزرتی ہے چاندنی اے دوست

ہر چند غم اُٹھانے کو جی چاہتا نہیں،
لیکن انھیں بھلانے کو جی چاہتا نہیں

اب چاہے دل کو پھونک ہی دے شمع آرزو
لیکن اسے بجھانے کو جی چاہتا نہیں

ڈرتا ہوں حال کہتے کہ ہوگا انھیں بھی غم
اور ان سے کچھ چھپانے کو جی چاہتا نہیں

صادق کبھی یہ بات تھی وجہ سکوں مگر
اب حال بھی سنانے کو جی چاہتا نہیں،

اُن کے نزدیک رہ کے بھی اکثر
میں نے محسوس کی ہے تنہائی

ان سے تو کہہ رہا ہوں ساحل ملے گا لیکن
طوفان وہ اُٹھا ہے خود میں بھی ڈر رہا ہوں

غمِ محبت کو دل نے سمجھا تھا سہل جیسے غمِ زمانہ
مگر اُٹھایا یہ بوجھ میں نے تو جھک گیا زندگی کا شانہ

ہم اپنی روداد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے — اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ
نظر ہے مہر و کرم کی مجھ پر لبوں پہ اک طنز یہ تبسم — شکست تسلیم کی ہے اس نے مگر بہ اندازِ فاتحانہ
کسی کے جانے کے بعد صادق کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے — کہ ایک مرکز پہ جیسے آکر ٹھہر گئی گردشِ زمانہ

اب کچھ عجیب طرح بسر ہو رہی ہے زیست — جیسے کہ اب نہیں ہے ترا انتظار بھی
ہم کو تو عشق میں بھی ہے دشوار زندگی — جیتے ہیں کیسے لوگ محبت کئے بغیر
یاد کسی کو کر لیا چپکے سے دل میں رو لئے — اس کے سوا اب اور کیا رہ گیا اختیار میں
تم کیا سمجھ سکو گے مرے دل کی واردات — تم کو بھی کاش ہوتی محبت کسی کے ساتھ
بڑھایا ہاتھ تو کانٹوں میں جا پھنسا دامن — پسند کی تھی گلستاں میں اک کلی میں نے!
یہ اور بات ہے دن کس طرح کٹے لیکن — ترے بغیر گزاری تو زندگی میں نے
یاد بس رہ گیا انجامِ محبت ہم کو — اور یہ بھول گئے کیسے ہوا تھا آغاز
عقل پھر دینے لگی ہے درسِ ترکِ میکشی — ایک ساغر اور ساقی مجھ کو ہوش آنے لگا
کون تھا آتا جسے میری نقاہت کا خیال — تھام کر دل رہ گیا جب کارواں جانے لگا
اچھا ہوا کہ توڑ دیا تم نے دل میرا — اب فکرِ احتیاط سے فرصت ملی مجھے
سہارا ڈھونڈتا ہوں زندگی کا — اگر تم مسکرا دو مہربانی
اکثر ترے تابندہ تصور کے سہارے — چھو آیا ہوں میں چرخ پہ چاند اور ستارے
اب جی یہ چاہتا ہے رہیں سب سے بے نیاز — اب کوئی ہم سے بولے نہ بولیں کسی سے ہم
ہونٹوں تک آتے آتے ساغر چھلک گئے ہیں — آیا خیال جب بھی اوروں کی تشنگی کا
نہ پھر کچھ ہو سکے گا چل پڑی کشتی جو دھارے پر — اب اس کو سوچ لو تم ساتھ میرے ڈوبنا ہوگا
ملال ہوگا قریب ساحل اگر یہ طوفاں کی زد میں آئے — جو میری کشتی کو ڈوبنا ہے تو بیچ دریا میں ڈوب جائے
تیری توجہ بھی ہے انھیں پر جو اپنی روداد کہہ رہے ہیں — مگر ہیں ایسے بھی انجمن میں جو چپ ہیں زخمِ جگر چھپائے
تلاشِ مقصد میں جب چلے تھے تو ہمسفر تھے بہت ہمارے — حیات کی منزلوں میں لیکن ہیں اب اکیلے لٹے لٹائے
یہ تند تند موجیں یہ تیز تیز دھارا — ڈھونڈو گے تو انھیں میں مل جائے گا کنارا
اب اس کو کوئی سمجھے بے وفائی یا کہ مجبوری — بہرصورت کسی کو بھول جانے کا ارادہ ہے
کسی کا دل دکھا کر جیتنا بھی جیت ہے کوئی — محبت میں اب ان سے ہار جانے کا ارادہ ہے
یقیناً پھر کوئی طوفان آنے والا ہے صادق — کہ پھر آج اپنے دل میں مسکرانے کا ارادہ ہے
ترے آگے اپنی ہستی کا رہے کیونکر خیال — وہ نہیں محفل میں تیری جو تری محفل میں ہے
ہر قدم پر اب یہی محسوس ہوتا ہے مجھے — جیسے کوئی کہہ رہا ہے تیری منزل دور ہے
گلہ ہوتا نہ اپنی تشنہ کامی کا کبھی ساقی، — مگر دیکھا یہ ہے اکثر چھلک جاتے ہیں پیمانے
نہ ہے لبوں پہ تبسم نہ ہے نظر میں پیام! — وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے
آئی ہے جب بہار تو تم ہو گئے ہو دور — کھلنے لگے ہیں پھول تو مرجھا گیا ہے دل
یوں خوش ہے کھو کے زیست کی دلچسپیاں تمام — گویا جو چیز چاہئے تھی پا گیا ہے دل

بہار آگئی اور گل مسکرائے — مگر جن کو آنا تھا اب تک نہ آئے
محبت کی تشریح ممکن نہیں ہے — محبت سمجھ میں اگر آ بھی جائے

انقلاباتِ جہاں کا انتہائی ظلم ہے — یہ تری معصوم آنکھیں اور نم میرے لئے

بے درد سہی بے مہر سہی سب کچھ وہ سہی صادق لیکن — جب ان سے نظر مل جاتی ہے بے ساختہ پیار آجاتا ہے

تقدیر کسی کو بھی نہ وہ وقت دکھائے — ہر سانس جب اک بوجھ ہو اور موت نہ آئے

بڑھ گئی جب شدتِ غم اور میں گھبرا گیا — ان کے ہونٹوں پر اک ہلکا سا تبسم آگیا
ہم نے سمجھا تھا بہت آسان ہے راہِ وفا — چل پڑے دو گام تو دیکھا پسینہ آگیا
کون سی منزل میں لے آئی ہے گردش وقت کی — ابتو پورے کارواں کا کارواں گھبرا گیا
حسن سے خود عشق ہی نے مان لی آخر شکست — ان حسیں آنکھوں میں آنسو مجھ سے کب دیکھا گیا

کر گزرتے ہیں وہی آتا ہے جو دل میں خیال — اتنی فرصت ہی کہاں سوچیں کہ کیا کرتے ہیں ہم

اب بگڑ کر بھی دیکھ لیں ان سے — شائد اس طرح بات بن آئے
سادگی کہئے یا اسے قسمت — ہم نے اکثر فریب ہی کھائے
دل سے جب بھولنے کی کوشش کی — اور شدت سے آپ یاد آئے
میں ہوں دیوانہ خیر دیوانہ — اور ناصح جو مجھ کو سمجھائے ؟

اُن کو کیا دیکھا بس اتنا ہوش ہے — سامنے بجلی سی اک لہرا گئی

برق چمکی تھی روشنی کے لئے — لگ گئی آگ آشیانے کو

کیا ڈھونڈھتے ہو راہِ طلب میں نقوشِ پا — ایسے بھی کچھ مٹے ہیں کہ جن کا نشاں نہیں

دُرد و صافی دونوں میں اک کیف سا پاتا ہوں میں — جو بھی دیدیتا ہے ساقی ہنس کے پی جاتا ہوں میں

گلستاں کا رنگ بدلا ہے بہار آنے کے بعد — اپنا عالم ہے وہی جو تھا ترے جانے کے بعد
اب کہاں وہ لذتِ غم اب کہاں وہ دردِ دل — ہم نے سب کچھ کھو دیا ہے آپ کو پانے کے بعد
ہم کہیں تھے دل کہیں تھا اور نگاہیں تھیں کہیں — ایک سناٹے کا عالم تھا ترے جانے کے بعد

نہ جانے اسپہ بھی کیوں تری آرزو ہے مجھے — یہ جانتا ہوں کہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا

نہ کہتے ہوں انھیں مجبوریوں کو عشق کہیں — انھیں بھلانے کی کوشش تو کی بھلا نہ سکا

برقِ بلا سے اتنا ہوتا ہے قرب اس کو — جتنی بلندیوں پر ہوتا ہے آشیانہ
دُنیا کی اُنگلیاں اب اُٹھنے لگیں ہیں مجھ پر — ہلکی سی ایک کروٹ اے گردشِ زمانہ

بات یہ اور ہے کچھ کہنے نہ دے پاسِ وفا — آپ کے جور سے تکلیف مگر ہوتی ہے

اتفاقاً ذکر جب آیا ترا عالم نہ پوچھ — ہم تو سمجھے تھے بھلا بیٹھے ہیں تجھ کو دل سے ہم

جب ان سے نظر ملتی ہے بن جاتا ہوں تصویر — جیسے کبھی پہلے انھیں دیکھا ہی نہیں ہے

آئے ہیں زندگی میں وہ لمحات بھی کبھی — جب سوچنا پڑا ہے خدا ہے بھی یا نہیں !

جو چاہتے ہو تو تم پھیر لو نظر اپنی — ہنوز دلپہ مجھے اختیار باقی ہے
گریز مجھ سے نہ کر گردشِ حیات ابھی — کچھ اور طاقتِ صبر و قرار باقی ہے

خونِ سحر

(فضا ابن فیضی)

یہ نسیمِ ناوک افگن یہ بہارِ زخم ریز　　اُٹھ رہا ہے کن سمن زاروں سے شورِ رستخیز
دیر سے بزمِ تمدن کی ہیں شمعیں دُود خیز
جھلملاتے ہیں ستارے۔ چاندنی راتیں ملول　　آئینے ملتے ہیں اپنے چہرۂ زیبا پہ دھول
یہ افق کی وسعتوں سے "ظلمتِ" نو کا نزول
تیرگی افروز ہے آئینہ خانوں کا جمال،　　مہرِ شبنم میں کہاں باقی وہ روحِ اتصال
ماہتابِ زرفشاں کو کھا گیا رنجِ زوال
کتنے کمھلائے ہیں لالے، بجھ گئے کتنے چراغ　　پی کے اپنا ہی لہو آسودہ مس کتنے ایاغ
کیا خبر تجھ کو ابھی کتنے جگر ہیں داغ داغ
کن سویروں پر نہ اُبھرے طاستوں کے پیچ خم　　کن چراغوں پر نہ فرمایا ہواؤں نے کرم
کن سفینوں پر نہ توڑے ناخدائی نے ستم
شمع کے آگے پڑی ہے اس کے پروانے کی خاک　　یہ جہانِ آب و گل ہے کس قدر آشوب ناک
پرزے پرزے ہیں گریباں اور قبا میں چاک چاک
آگ میں اپنی ہی خود یہ زندگی جلتی ہوئی　　یہ سکون و آشتی کی دوپہر ڈھلتی ہوئی
رات کی ظلمت شفق کی گود میں پلتی ہوئی
دیکھ! کمھلائے وہ گلہائے بہارِ دلنواز　　خون روتی ہے چمن میں نرگسِ مستی طراز
کتنے قرنوں سے ہے ویراں تاک کی محرابِ ناز
پی چکی ہے کتنے جلوؤں کا لہو تاریک رات　　زہر سے سرسبز ہیں کتنے نشہ زارِ حیات
دل فگار و خاک بر سر ہے "عروسِ کائنات"
تا کجا! تا کجا یہ سرگرانی تا کجا!　　ہر نفس آمادۂ نشتر فشانی تا کجا!
پھول کے ہونٹوں پہ کانٹوں کی کہانی تا کجا!
ہے تپش آمادۂ پرسوز پروانوں کی خاک　　برق بن کر جاگنے کو ہے جہانِ سوز ناک
ہیں سزاوارِ رفو پھر تیرے پیراہن کے چاک
تابشِ انجم نظارہ سوز ہے افلاک سے　　پھوٹنے والی ہیں کرنیں پھر زمینِ خاک سے

اختر بھوپالی :

رہا جو اہلِ درد سے تو اتنا واسطا رہا
وہ خود نگر کبھی کبھی ادھر بھی دیکھتا رہا

سحر ہوئی تو ماحصل یہ تھا شبِ امید کا
جو اعتبار تھا گیا جو انتظار تھا رہا

عجیب مرحلے تھے وہ رہِ حیات کے جہاں
نہ دل سا راہزن رہا نہ غم سا رہنما رہا

میں سوچتا ہوں تیرے ساتھ زندگی میں کیا نہ تھا
میں دیکھتا ہوں تجھ سے چھٹ کے زندگی میں کیا رہا

فضائے رنگ و رنگ میں جہانِ جہد و جنگ میں
کہاں کہاں غریب دل تمھیں پکارتا رہا

شفقت کاظمی (بطرزِ حسرت)

متاعِ جاں کو ترے نام پر نثار کیا
خوشا نصیب کہ یہ فرض بھی اُتار آئے

کہیں پتہ دلِ گم کردہ راہ کا نہ ملا
رہِ طلب میں بہت دور تک پکار آئے

اُن کے آگے کہاں مجال کہ ہم
اپنی محرومیوں کی بات کریں

انتہا اپنی خواہشوں کی نہیں
مجھ پہ کب تک وہ التفات کریں

جن کو ہے فکرِ آشیاں بندی
کیوں وہ پروائے برق و باد کریں

شکر تقدیر کے سوا شفقت
اور کیا ہم سے نامراد کریں

ندیم جعفری :

وہ چل رہے ہیں مگر یہ عالم ہے اُن کی بدحال مستیوں کا
کہ جیسے ہر ایک رہگذر پر کھلے ہوئے ہوں شراب خانے

نہ کام آئیں یہ احتیاطیں نہ ٹوٹے رشتے محبتوں کے
تری ملاقات کو ہمیشہ نکل ہی آتے ہیں کچھ بہانے

کہا گیا تھا ندیم ہم سے بہار آئے گی جشن ہوگا
مگر کچھ ایسی بہار آئی اُجڑ گئے ہیں سب آشیانے

بھڑک نہ جائے بغاوت کی آگ سجدوں میں
جبینِ شوق جھکاتے ہوئے لرزتے ہیں

ترے زمانِ محبت میں ہم پہ کیا گزری
یہ روئیداد سناتے ہوئے لرزتے ہیں

بشر نواز :

سمجھ کر سنگِ راہِ شوق ٹھکراتا ہوں منزل کو
کمالِ آگہی کہئے اسے یا گم رہی کہئے

بعنوانِ دگر پھر تم نے قایم کر لیا ہم سے
وہ اک گہرا تعلق جس کو ترکِ دوستی کہئے

بعد پروانوں کے ہوتی گئیں شمعیں خاموش
کون کرتا ہے شہیدانِ وفا کا ماتم

لذتِ سوزِ نہاں، حاصلِ پیمانِ وفا
اب بھی مسرور ہوں میں تیرے تغافل کی قسم

رازؔ :

خرد کا ذکر نہ کر چپ کبھی یہ بھٹکی ہے
جنوں نے اس کو دکھایا ہے راستہ ساقی

ہزار شکر کہ دل خون ہو گیا آخر
کفِ حیات میں بے رنگ تھی حنا ساقی

کیا نہ رازؔ کی خود داریوں نے رخ بھی ادھر
ہوا تھا وا درِ جنت تو بارہا ساقی

شفاؔ گوالیاری :

بڑی جانسوزیوں سے درد کے آئینے ڈھلتے ہیں
پگھل کر سینکڑوں آنکھوں سے دو آنسو نکلتے ہیں

رہِ اُلفت میں ایسے راہرو بھی ہم نے دیکھے ہیں
جو رہبر کو بھی اپنی رہبری میں لیکے چلتے ہیں

نظامِ عالمِ امکاں کی ہلجاتی ہیں بنیادیں
تڑپ کر غم کے مارے جب کبھی کروٹ بدلتے ہیں

اندھیرے مسکراتے ہیں شفاؔ جن کے اُجالوں پر
جہاں میں کچھ چراغِ زندگی ایسے بھی جلتے ہیں

نظرؔ شاہجہاں پوری :

تاریک اس قدر تو نہ تھی میری شامِ غم
لوٹے گئے کہاں مہ و انجم کے قافلے

اے انتہائے شوقِ تکلم ترے نثار
آنکھوں نے داستان کہی لب نہیں ملے

گزارتا ہوں بہر حال زندگی اے دوست
یہ اختیار ہے یا جبر ہے خدا جانے

سمجھ میں آ نہ سکا زندگی کا راز نظیرؔ
یہ ساز ہے کہ فقط سوز ہے خدا جانے

لٹانا پڑا ہے جہاں زندگی کو
مقامِ وفا چند ایسے بھی آئے

یہ روداد ہے مختصر زندگی کی
بہت کچھ کہا اور کچھ کہہ نہ پائے

اُسی کے لئے اے نظرؔ گلستاں ہے
حوادث کو جو آشیانہ بنائے

مشکلات غالب

غالب کے یہاں ہم کو اتنے مختلف رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس کے دیوان کو زنجیر فرض کرلیں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئے گی اور کوئی کڑی کسی رنگ کی۔

اس کے یہاں تصوف و حکمت بھی ہے اور وعظ و نصیحت بھی۔ خالص عاشقانہ رنگ بھی ہے اور رندانہ شوخی و بے باکی بھی۔ بلند معنی آفرینی بھی ہے اور سطحی نقاشی بھی ۔۔۔ گویا وہ ایک گلدستہ ہے مختلف رنگ کے پھولوں کا جس میں ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق و پسند کا پھول ملجاتا ہے اور غالباً یہی سبب اس کے قبول عام کا ہے۔

غالب کا نام سنتے ہی اس کی مشکل پسندی و دقیق نگاری ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا بڑا مشکل پسند انسان تھا اور بیان کے نئے زاویے تلاش کرنے کے لئے اس کا خیال ہمیشہ دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گزرنا پسند کرتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے سہل و سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گرہ ضرور چھوڑ جاتا تھا چہ جائیکہ حکمت و تصوف کے دقیق اشعار کہ انھیں تو معنوی نزاکت اور ندرت تخئیل کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہئے تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا حالی کو بھی یادگار غالب میں اس کے بعض مشکل اشعار کی شرح کرنا پڑی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہ ہوا یہاں تک کہ کلام غالب کی متعدد شرحیں وجود میں آگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ شارحین غالب نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، لیکن بعض نے لفظی و لغوی تحقیق پر ضرورت سے زیادہ زور دیا، بعض نے اس عقیدہ کی بنا پر کہ غالب کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ تان کی کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش۔ بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالب کا ہر شعر حکمت و فلسفہ نظر آیا اور اس کی شرح و تفسیر میں وہ غالب سے زیادہ ناقابلِ فہم ہوکر رہ گئے اور بعض نے اس خصوصیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ بعض شرحوں میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں بہت زیادہ تطویل و اطناب، الغرض اتنی شرحوں کی موجودگی کے باوجود ایک معتدل قسم کی شرح کی ضرورت یقیناً باقی تھی اور بعض احباب نے مجھ سے ایسی شرح لکھنے کی بارہا خواہش بھی کی، لیکن میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

اس دوران میں اکثر طلبہ میرے پاس آئے اور انھوں نے غالب کے بعض اشعار کا مفہوم مجھ سے دریافت کیا تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کے اساتذہ نے جو مفہوم ان کو بتایا ہے وہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور جس دور از کار طریقہ سے انھیں سمجھایا گیا ہے وہ یقیناً طلبہ کے ذہن و دماغ کے لئے مناسب نہیں، اس لئے مجھے اس کے لئے وقت نکالنا پڑا اور وہ کام جو عرصہ سے ملتوی ہوتا چلا آرہا تھا اس کی ابتدا اس مہینہ سے ہورہی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ ختم سال تک یہ کام انجام کو پہونچ جائے۔

میرا مطمح نظر یہ ہے کہ غیر ضروری مباحث میں اُلجھے بغیر بہت سادہ الفاظ میں شعر کا مفہوم واضح بیان کر دیا جائے اور صرف ان اشعار کو لیا جائے جن میں واقعی کوئی اشکال پایا جاتا ہے۔

اخیر میں ایک انتخاب بھی پیش کروں گا جس سے معلوم ہوسکے گا کہ غالب نے کس رنگ میں کتنے اچھے شعر کہے ہیں۔

نیاز

غزل (۱)

۱۔ نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش = نگار خانۂ عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

شوخیِ تحریر = شوخیِ نقش، یعنی نقاش کی اُپج

کاغذی پیرہن = ناپایدار لباس جس سے مراد ہے ہستی ناپایدار (اس میں رعایت اس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرنے جاتا تھا)

کس کی = سوالیہ نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال ہوا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ:۔ اس نگار خانۂ عالم کا ہر ہر نقش یعنی کائنات کی ہر ہر چیز نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبانِ حال سے اپنی ناپائداری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔

یہ شعر حمد کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار اور موجودات عالمِ فنا پذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کو ثبات نہیں۔

۲۔ کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاوِ کاوِ = کھودنا۔ کاوش۔ غیر معمولی محنت۔

سخت جانی = انتہائی تکلیف جھیل جانے کی اہلیت۔

جوئے شیر لانا = اشارہ ہے فرہاد کے قصہ کی طرف جسے شیریں نے پہاڑ کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے کا حکم دیا تھا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف سے تنہائی کی راتیں بسر کرتے ہیں وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

کاوِ کاوِ اور سخت جانی ـــــ صبح اور جوئے شیر میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرتِ بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دمِ شمشیر = تلوار کی دھار ـــــ دم سانس کو بھی کہتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ:۔ "میرے شوقِ شہادت کے جذبۂ بے اختیار کو دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لئے بے اختیار ہو گئی اور اس کا دم باہر آگیا۔

"دم باہر آنا" اس معنی میں اُردو کا محاورہ نہیں اور محض غالب کی اختراع ہے۔ اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قایم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دمِ شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔ اس قسم کی رعایت لفظی رکھنے والی شاعری عہدِ ناسخ کی یادگار ہے اور ارباب ذوق اسے پسند نہیں کرتے۔

۴۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مفہوم یہ ہے کہ:۔ "میرے اشعار سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے لیکن ان کا سمجھنا محال ہے، یعنی جس طرح

جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی، اسی طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے اشعار کا مفہوم بھی نہیں پھنس سکتا۔
اسی مضمون کا ایک اور شعر غالب کا یہ ہے :-

گر خامشی سے فایدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

اس قسم کے اشعار تغزل سے باہر سمجھے جاتے ہیں جن میں ندرتِ بیان اور لفظی صناعی کے علاوہ کوئی خوبی نہیں پائی جاتی۔

---

۵ - بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا = بیقرار، بیتاب - موئے آتش دیدہ = وہ بال جسے آگ دکھا دیجائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا۔
مفہوم یہ ہے کہ :- "چونکہ میں اسیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لئے میری زنجیر کا حلقہ موئے آتشدیدہ ہوکر رہ گیا ہے۔
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ آتش پر قایم ہے اور اگر آتشِ زیر پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ "بیقرار" رکھ دیا جائے تو شعر مہمل ہوکر رہجائے
یہ شعر بھی ناپسندیدہ رعایت لفظی و ایہام کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔ لفظ حلقہ، "ہر حلقہ" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے خالی نہیں۔ اس غزل کے تمام اشعار میں (سوا دوسرے کے) لفاظی اور خشک ندرت بیان کے سوا کچھ نہیں۔

غزل (۲)

۱- جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بتنگیِ چشمِ حسود تھا

بتنگی = تنگی ـــ حسود = حاسد ـــ تنگی چشم = بخل ـــ بروئے کار آنا = سامنے میدان میں آنا۔
یعنی قیس (مجنوں) کے سوا کوئی اور صحرا میں اسکے مقابلہ کے لئے نہ آیا، یعنی وہی ایک میدان عشق کا مرد تھا۔ اسکی توجیہ غالب نے یہ کی کہ صحرا چشم حاسد کی طرح تنگ تھا اور تنگی چشم میں کسی دوسرے کی گنجایش نہ تھی۔
اس شعر کی بنیاد بھی لفظ تنگی پر قایم ہے اور اس سے فایدہ اٹھاکر معمولی بات کو گھما پھرا کر بیان کیا گیا ہے، اس میں بھی صرف لفظوں کا کھیل ہے اور کچھ نہیں۔

۲- آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی = پریشانی، پریشاں خاطری ـــ نقش سویدا = دل کا سیاہ داغ یا نقطہ ـــ دود = دھواں ـــ نقش درست کرنا = نقش پیدا کرنا۔
مفہوم یہ ہے کہ: ہمارا داغ دل محض ہماری پریشاں خاطری کا نتیجہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سرمایہ محض دود (دھواں) ہے، جس کی آشفتگی ظاہر ہے۔
مدعا یہ کہ جب تک آشفتگی پیدا نہ ہو داغ دل میسر نہیں آسکتا۔ یہ شعر ندرت بیان کا اچھا نمونہ ہے۔

۳- تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ،　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یہ شعر بھی غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو باوجود سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اُلجھن "زیاں و سود" کے ذکر نے پیدا کردی ہے، کیونکہ کسی سے معاملہ ہونا "باہم عہد و پیمان کی گفت و شنید" کا

مفہوم رکھتا ہے اور اگر تجھ سے خطاب "محبوب" کی طرف ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملۂ محبت اور عہدِ وفا لینے پر جھگڑ رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور یہ سارا طلسم درہم برہم ہوگیا، لیکن یہ مفہوم قرار دینے کے بعد "نہ زیاں تھا نہ سود تھا" کہنا درست نہیں ہوسکتا، کیونکہ آنکھ کھلنے کے بعد جو افسوس ہوا ہوگا وہ یقیناً زیاں کی صورت ہے۔

اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ:۔ "کاروبارِ حیات سے رابطۂ خداوندی کے سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی، اور جب ہم نے اس کو محسوس کیا تو ہماری بے علمی بدستور ویسی ہی رہی جیسے پہلے تھی اور اس سے نہ ہم کو کوئی فائدہ پہونچا نہ نقصان"

۴۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا،

مکتبِ عشق یا مکتبِ غمِ دل میں اب بھی ایک مبتدی طالب علم کی حیثیت رکھتا ہوں اور جس طرح ابتدائی تعلیم میں رفت گیا اور بود تھا سمجھایا جاتا ہے اسی طرح میں اب بھی اسی "رفت و بود" کا سبق لے رہا ہوں، یعنی یہ کہ دل جو کسی وقت اپنا تھا، چلا گیا اور دوسرے کا ہوگیا، حالانکہ اس منزل سے گزر کر مجھے دل کے جانے کا احساس بھی نہ ہونا چاہئے تھا۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ننگِ وجود ہونا = وجود کے لئے باعثِ شرم ہونا۔

مفہوم یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رنگ میں وجود کے لئے باعثِ شرم تھا اور کسی لباس سے میرے عیوب چھپ نہ سکتے تھے، اس لئے اچھا ہوا کہ میں مرگیا اور کفن نے داغِ عیوب کو ڈھانپ لیا۔

۶۔ تیشہ سے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا،

سرگشتۂ خمار = متوالا رسوم و قیود = دنیاوی پابندیاں۔

مفہوم یہ ہے کہ:۔ کوہکن (فرہاد) رسومِ ظاہری کا پابند تھا کہ اس کو مرجانے کے لئے سر پر تیشہ مارنے کی ضرورت ہوئی، ہماری محبت فرہاد سے زیادہ بلند ہے جو جان دینے کے لئے ان ظاہری اسباب کی محتاج نہیں۔

غزل (۳)

۱۔ کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

ہم نے مدعا پایا = ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے یعنی دل ہمارے پاس کہاں وہ تو تمہارے ہی پاس ہے اور ازراہِ شوخی = کہتے ہو کہ اگر پڑا پایا تو نہ دیں گے۔

۲۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

درد کی دوا پائی یعنی دردِ زندگی کی دوا پائی۔ مدعا یہ کہ جب تک محبت نہ کی تھی، زندگی درد تھی، اب اسکی جگہ دردِ محبت نے لیلی جسکی کوئی دوا نہیں۔

۳۔ سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

حسن کی ظاہری سادگی و بے پروائی پر نہ جاؤ کہ وہ دراصل چاہنے والوں کا امتحان ہے کہ عشاق کہیں اپنی حد سے آگے تو نہیں بڑھ جاتے۔

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور لب و لہجہ کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ وماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشاء، غالبہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے عار (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا غذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی پر عمدہ تبصرہ، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون لطیفہ، حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ وغیرہ پر پیشگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(اردو نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، اردو کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے ۶/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نقاد و مصور کے بنایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ ۶/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستانی نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تعلیمات اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے روشن کو نہ بھول جائیں جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے درجنے ہیں، پہلے حصے میں آرس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے عار (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء / حسرت نمبر

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے عار (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

اداغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانے کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے عار (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ حاصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت نو روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات و ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت نو روپیہ آٹھ آنہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ